بلراج ورما

کابوس

گیارہ افسانے

بلراج ورما

کوئی ایسی سردی نہیں ہوتی ورنہ غضب ہو جاتا۔

"تم ان سپاہیوں کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"سپاہی نہیں فوجی، اپنے سپاہی تو پڑے اونگھ رہے ہیں۔ میں ان گورے فوجیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دنیا میں جمہوریت کے تحفظ کے لیے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلا حق انھیں کا تھا۔ مہمان پرستی تو یوں بھی ہمارا روایتی شعار رہا ہے۔"

کیا منظر تھا وہ بھی۔

جنگلے کے پیچھے چھ بیڈ ——— جیسے اکثر ہسپتالوں میں دیکھے جاتے ہیں، اور ان پر چھ جوان ہندوستانی عورتیں۔ اور اُن کی خوش مزاج منیجر ——— نرس جیسے کپڑے پہنے ہوئے ——— ہاتھ میں سرخ پانی بھری سرنج..... وہ ہر گاہک سے مُسکرا کر تپاک سے بولتی۔ لوگ بدتمیزی کرتے تو بھی بُرا نہیں مانتی۔

"گاہک ہمیشہ دوست ہوتا ہے۔"

جنگلے کے باہر درجن دو درجن کے قریب خریدار لائن بنائے کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ جنگ کی باتیں۔ ہٹلر کی باتیں۔ تقدیر و تدبیر کی باتیں۔

خدا نے آدمی کو خود اپنی ہی شکل پر بنایا ہے، ایک پادری سی قسم کا سپاہی دوسرے کو سمجھا رہا ہے۔

اس کا کیا ثبوت!

اس کا ثبوت ہمارا مسیحا ہے یسوع مسیح۔ عیسیٰ۔ خدا کا جیتا بیٹا۔

میں عیسیٰ کا بیٹا ہوں۔

ہم سب عیسیٰ کی بھیڑیں ہیں۔

عیسیٰ بنی نوع کو گناہوں سے بچانے کے لیے آیا تھا۔

لیجئے آپ بھی دیکھئے۔ مگر آپ تو تبھی دیکھ سکیں گے نہ جو ہم دکھا سکیں گے۔ خیر کوشش کرنے میں کیا قباحت ہے۔

ہاں تو صاحب سامنے والا گھر ہمارے والے اس گھر کے عین بالمقابل ہے اور دونوں کے درمیان بہ مشکل چار چھ فٹ کی خلا ہے۔ جس میں دونوں گھر کے مکین یعنی کرایہ دار اپنے اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ بلا تکلف دن رات پھینکتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہی ایسا کمرہ اُدھر دوسری طرف بھی ہے اور اس میں بھی ہماری ایسی ہی کھڑکیاں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پانی کا نل جو اس کمرہ میں بھی ہے ہمارے نل والی کھڑکی کے بالمقابل نہ رہ کر ہماری دوسری والی کھڑکی کے سامنے بنا ہوا ہے، اور ہمارے نل والی کھڑکی کے سامنے جو کھڑکی ہے، اور جو کھل اور بند بھی ہو سکتی ہے، اس میں ایک دبیز صوفہ چیئر رکھی ہے، جس پر ایک خاتون بڑے سکون سے ٹانگیں پھیلائے ننگ دھڑنگ بیٹھی ہیں۔ ان کے بیٹھنے کے انداز میں کوئی ادا یا تکلف نہیں گویا وہ اسی طرح بیٹھنے کی عادی ہوں۔

ان کے قدموں میں انھیں کی طرح ننگ دھڑنگ ایک مسکین سی قسم کا شہدہ سُکڑا سمٹا بیٹھا ہے۔ خاتون کے ہاتھ میں ایک سویگر سٹک ہے۔ بالکل ایسی جیسی بڑے فوجی افسران کے ہاتھوں میں اکثر دیکھی جاتی ہے۔

شہدہ بیچارہ نہتا ہے۔

عورت نے ہمیں دیکھا تو مسکرائی، جھجکی وغیرہ کچھ نہیں۔ شہدہ نے البتہ ہماری جانب دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

عجیب وغریب منظر ہے۔ ہے نہ۔

منٹ دو منٹ بعد شہدہ کا ہاتھ محترمہ کی پنڈلیاں سہلاتے سہلاتے ان کے گھٹنوں کے اوپر سرکنا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ پر زور سے چھڑی کا وار پڑتا ہے۔ وہ اسی طرح مار کھائے جا رہا ہے مگر اپنی اس حرکت سے باز نہیں آ رہا۔ وہ پوز بدلنے کے لیے بھی ذرا اوپر اٹھنا چاہتا ہے تو چھڑی حرکت میں آجاتی ہے اور اس کے نیم گنجے سر پر۔

ہم بے بس ہیں کھڑکی بند نہیں کر سکتے اور تر کاری بنانے کاٹنے کے لیے دوسری کوئی جگہ بھی کمرہ میں نہیں ہے۔

ہم سوچتے ہیں۔ ہم مرد ہیں۔ جب عورت کو شرم نہیں تو ہم ہی کیوں موم کی طرح حیا کی تپش میں

پگھلتے جائیں۔

اب ہم بھی اس کھیل میں ذہنی طور پر ہی سہی، باقاعدہ شریک ہیں۔ ہم سبزی کاٹتے جاتے ہیں اور سامنے کا منظر بھی دیکھتے جاتے ہیں، عورت کی اشتہاری مسکراہٹ میں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ وہ دونوں اپنے اس عجیب و غریب کھیل یا تنازع میں پوری دلچسپی سے مصروف ہیں۔

ہم نے لوکی کاٹی، پیاز لہسن، ادرک اور ٹماٹر کاٹے۔ سٹوو جلایا، اس پر پیاز لہسن اور چھلا ہوا ادرک بھوننا شروع کیا۔ مسالہ بھُن کر تیار ہو گیا تو ہم نے اس پر صبح کے سالن کا شوربہ گوشت الگ کر کے ڈالدیا۔ پھر لوکی بھی ڈالدی۔ دس پندرہ منٹ بعد جب لوکی نیم تیاری کو پہنچ گئی تو ہم نے اس میں علیحدہ رکھا ہوا گوشت بھی ڈالدیا۔ اتنے میں بھی سامنے کے منظر میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی نہ وہ غریب مسکین اپنی مجنونانہ حرکت سے باز آیا نہ وہ عورت اور نہ اس کی چھڑی۔

یہ عورت ہے کون؟ کوئی پیشہ ور طوائف۔ کوئی بگڑی ہوئی فلمی ایکٹرس کوئی بیمار مغز سلٹ یا پھر کوئی تشنہ آرزو، سادیت کی مریضہ

اور وہ آزردہ و مغموم خبیث۔ یہ آدمی ہے یا سنڈاس کا کیڑا۔

عورت خاصی قبول صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ کبھی کافی حسین رہی ہوگی۔ مگر اب تو ——— وہ جس انوکھی ادا سے اپنے پاؤں سے لپٹے اس خبیث کتے کو جنسی ایضا پہنچانے کا لطف لے رہی ہے اس سے بھی اس کے کردار کی کوئی واضح تصویر نہیں بنتی۔ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ بیچاری بے حد اداس بھی ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جسے ہم لمحہ بھر پہلے اس کی اشتہاری مسکراہٹ کہہ رہے تھے، وہ دراصل بڑی ہی دلگیر ملوں اور حزیں مسکراہٹ تھی گویا وہ عورت کسی بڑے ہی اندوہناک تجربہ سے گزر رہی ہو اور اس کا مضروب ساتھی اپنے کمزور ہاتھوں کی مضراب سے جن تاروں کو جھنجھنانا چاہتا ہے وہ ڈھیلے پڑ کر کب کے بے آواز ہو چکے ہیں۔

اور یہ سب۔ سب کا سب۔ ناقابل اصلاح ہے۔

ارے یہ کیا ہم تو بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں ان انجانے لوگوں کے بارے میں۔

لعنت ہے ہم پر۔

اچانک ہمارا سارا وجود نفرت اور حقارت سے بھر جاتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ سارے کا سارا گرم گرم شوربا پھینک کر اس خبیث مرد کی چاند اور عورت کی رانیں جلا دیں۔

یہ ہم نے سوچا ہی۔ خدا کا شکر ہے کہ کیا نہیں۔ ہم ایک بڑے ہی کمزور دل اور یتیم قسم کے

آدمی ہیں۔ بے گناہی کی ندامت سے ہم اپنے اندر ہی اندر ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ جم کر اُبھر کر کچھ کر گزرنا ہم سے کبھی نہیں بنا۔

گوشت اور سبزی چکھی تو لطف آگیا۔ نمک مرچ مسالہ سب مناسب اور ذائقہ ایک دم اے ون۔ اب سالن کو اے ون بنانے کے لیے ہم نے اپنا آخری اور برسوں کا آزمودہ حربہ استعمال کیا اور پاؤ بھر مکھن کی ٹکیہ سالن میں ڈال کر دیگچی بند کر دی۔ اور اسٹوو بجھا دیا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا اور رضا، عباس اور سلطان تقریباً ایک ساتھ کمرہ میں داخل ہوئے۔

ہم نے ایک نظر ان لوگوں کو دیکھا اور پھر گھوم کر سامنے والی کھڑکی کی طرف، مگر اب وہاں کچھ نہ تھا۔ کھڑکی کب بند ہوئی، دروازہ کھلنے سے پہلے، بعد، یا ایک ساتھ۔

ہم اندر کیسے آئے۔ ہم نے اندر آکر کیا دیکھا۔ ہمارے پاس دو دلچسپ کہانیاں تھیں۔ مگر ہم نے چپ رہ کر آنے والوں کے ردِ عمل سے لطف اندوز ہونے کے ارادے سے زبان بند رکھی۔

وہ تینوں چپ چاپ ہمیں گھورے جا رہے تھے۔

اور ہم مزے سے مسکرائے جا رہے تھے۔

"تم اندر کیسے آئے ہو؟"

"جیسے تم آئے ہو۔"

"کیا بکتے ہو!"

"بکنے کی اس میں کون سی بات ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں اندر ہوں اور اندر آنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ کھڑکیوں سے تو ظاہر ہے کہ میں گھسا نہیں۔"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔"

"تم علی بابا ہو کر پوچھتے ہو؟ میں نے کہا 'کھل جا' اور دروازہ کھل گیا۔ شکر کرو کہ میں چالیس چوروں کا سرغنہ نہیں ہوں، اور میں نے تمہارا کوئی خزانہ بھی نہیں چرایا۔

علی رضا نے اپنے ساتھیوں کی طرف مشکوک انداز سے دیکھا۔

وہ بُت بنے، بوکھلائے کھڑے تھے۔

"مجھے دیوی کا وردان ہے علی بابا۔ میں چاہوں تو تمہارے دیکھتے دیکھتے دیوار میں تحلیل ہو سکتا

ہوں۔ آزمانا منظور ہو تو پھر سے دروازہ مقفل کر کے نیچے ٹرک پر اتر جاؤ، میں تمہیں وہیں مل جاؤنگا۔

تب علی رضا نے جو قہقہہ پر قہقہہ لگانا شروع کیا تو عباس اور سلطان تو جیسے سکتے میں آ گئے۔

ہم سمجھ گئے کہ اس کی تیز نگاہوں نے دوسرے دروازہ کی غلط تختی پر چپکی چٹنی پہچان لی ہے ہم نے بھی جواباً ویسا ہی پُر بہار قہقہہ لگایا۔

ہنستے ہنستے ہم دونوں بے حال ہو رہے تھے۔ کافی دیر بعد جب یہ سلسلہ ذرا تھما تو علی رضا نے ہمارا کندھا سہلاتے ہوئے کہا "بھئی مان گئے ہم تمہیں۔ ہم دو سال سے اس سالی کھولی میں جھک مار رہے ہیں اور تم نے ایک ہی نظر میں بھانپ لی۔ اس کی اتنی بڑی کمزوری۔"

عباس اور سلطان ابھی تک ویسے ہی چُپ چاپ کھڑے تھے۔

ہم نے جواب دیا۔ "بھانپا ہم نے بھی کچھ نہ تھا۔ بس اتفاق ہی سمجھو۔ جو ——"

عباس نے غرا کر کہا "اب چھوڑو یہ لطیفہ بازی اور ہمیں بھی بتاؤ کہ تم اندر کیسے آئے۔"

"دروازہ کھول کر۔"

"مگر وہ تو مقفل تھا۔"

"تالا کھولا نہیں جا سکتا۔"

"مگر چابی؟" سلطان نے اپنی بساط کے مطابق جرح کی۔

"ارے احمق، چابی تو اور بھی بن سکتی ہے۔ یہ پوچھو کہ وہ دروازہ کھول کر اندر تو آ گئے، پھر باہر سے دروازہ پر قفل کس نے ڈالا۔"

بڑا مزہ رہا جب علی رضا نے اپنی دیرینہ حماقت کی تشریح فرمائی۔

"کمبخت نے ہنسا ہنسا کر بھوک بھڑکا دی ہے۔ جائیے جناب سلطان صاحب اور کافروں کی دوکان سے درجن تندوری روٹیاں اور قورمالے آئیے۔"

"گھر میں آٹا نہیں ہے کیا۔"

"آٹا تو ہے مگر وہ صبح والا سالن کون کھائے گا۔"

"تم روٹی پکاؤ سلطان میاں، سالن کا انتظام ہم کیے دیتے ہیں۔"

"ابے چھوڑ کبیر نے بھانجے۔ صبح ناشتہ پر پورے دس اڑا دیئے تھے تو نے۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔"

وشو کرما۔

اور ہم نے دیگچی کا ڈھکن پلٹ دیا۔ سالن کی خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو اُٹھا۔

علی رضا نے ایک بوٹی منہ میں ڈالی اور تالی بجاتے ہوئے چلّایا۔

" انقلاب ـــــ خدا قسم تو دنیا کا سب سے بڑا باورچی ہے۔"

☆ ☆ ☆

کھانے کے بعد سلطان شام اور اگلی صبح کے لیے سبزی، انڈے، ڈبل روٹی وغیرہ لینے چلا گیا، اور عباس ریڈیو اسٹیشن خبریں پڑھنے۔

"تم اس گھر میں دو سال سے رہ رہے ہو؟"

" دو سال تین مہینے سے!"

"یہ سامنے والا گھر اور تمہاری یہ بلڈنگ تقریباً ایک سے ہیں۔"

"تقریباً نہیں، قطعی ایک جیسے۔ دونوں عمارتیں ایک ساتھ ایک ہی آدمی نے بنوائی تھیں، حاجی دستگیر صاحب نے جو کبھی بمبئی میں پہلے نمبر کے ڈرامی فروٹ مرچنٹ تھے۔ اب یہ دو سگے بھائیوں کی ملکیت ہیں۔"

" اور ہمارے اس کمرے کے سامنے والے کمرہ میں جو غالباً ہماری ہی طرح کا ہے، اس میں کون صاحب رہتے ہیں؟"

اس پر علی رضا قدرے چونکے۔ "تو تم نے بھی؟"

" تو کیا اس سے پہلے تم میں سے بھی کسی نے وہ سب دیکھا ہے جو آج ہم نے دیکھا؟"

" تم نے دیکھا؟"

ہم نے ڈرامائی انداز میں حاتم طائی کی طرح فرمایا: " ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔"

" بکواس بند کرو اور سُناؤ سارا قصہ۔"

ہم نے بکواس بند کر دی اور سارا قصہ جوں کا توں بغیر مرچ مسالہ لگائے یا سجائے سنوارے سُنا دیا۔

یہ سب تو پہلے کسی نے نہیں دیکھا، مگر عباس اور مجروح صاحب بتا رہے تھے کہ انھوں نے اس کمرہ میں ایک مرد عورت کو ننگے گھومتے دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خطرناک بات ہے، اور

ہمیں کچھ کرنا چاہیئے۔ حج کے دن قریب ہیں۔ لکھنؤ سے درجنوں بزرگ بمبئی آئیں گے اور یہیں ٹھہریں گے۔ ان کے رہتے بھی ان لوگوں نے کوئی ایسی ہی حرکت کر ڈالی تو وہ کیا سوچیں گے۔ سید زادے نے انہیں کیسی منحوس جگہ ٹھہرایا ہے۔ ابا پہلے ہی ہماری فلمی وابستگی سے پریشان ہیں۔ اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

کیوں نہ آج ہی بلکہ اسی وقت۔

اگلے پانچ منٹ میں ہم دونوں بغل والی بلڈنگ کے کمرہ نمبر سات کے سامنے کھڑے گھنٹی بجا رہے تھے۔

اندر سے ایک مہین سی نسوانی آواز آئی "کون صاحب ہیں؟"

"ہم آپ کے پڑوسی ہیں" علی رضا نے بڑے تحمل سے جواب دیا، ان کے لہجہ میں غصہ وغیرہ ایسی کوئی علامت نہ تھی۔

دروازہ کھلا "آیئے تشریف لایئے"

تھیں تو یہ وہی دوپہر والی خاتون ہی مگر کالے کنارے والی سفید سوتی ساڑی اور آدھے بازو والے نیم سفید بلاؤز میں ملبوس، وہ اب قطعی نئی ہستی لگ رہی تھیں۔

بڑی بڑی، کالی کالی معصومیت سے دھیمے دھیمے مسکراتی ہوئی پُراسرار آنکھیں، چوڑی پیشانی، خوش رنگ چہرے پر انوکھی سجاوٹ سے سجی سجائی، ستواں ناک، بھرے بھرے نیم سُرخ ہونٹ اور سفید موتیوں ایسے بے داغ دانت۔

بھرے بھرے مگر کس کر تنے ہوئے خوبصورت جسم والی یہ عورت راجہ روی ورما کا کوئی ماڈل لگتی تھی دمینتی رادھا، سیتا۔ کوئی بھی۔

بڑا وقار تھا اس عورت کے سرتا پا وجود میں۔ کچھ عجب تمکنت سے آنکھیں جھپکائے بغیر وہ ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں کوئی سوال تھا نہ جھجک نہ شکایت نہ ندامت ہی۔

قدرے جھجک کر علی رضا نے کہا "ہم آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں"

"میں آپ کو جانتی ہوں رضا صاحب"

"یہ ہمارے دوست ہیں!"

"میں انھیں بھی جانتی ہوں"

"تو گویا ....."

"میں ہی کیا اڑوس پڑوس کا ہر آدمی آپ کے نام گرامی سے واقف ہے۔ آپ چائے لیں گے یا کہ ٹھنڈا ؟"

"جی ہم ——"

"دیکھئے آپ پہلی بار ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں۔ اتنی عزت بخشی ہے تو تھوڑی اور بھی ——"

"آپ ضرور ہی کچھ پلانا چاہتی ہیں تو ہم لوگ چائے لے لیں گے۔"

شکریہ کہہ کر وہ پردے کے پیچھے چلی گئی جو کمرے کے بیچوں بیچ کھنچا ہوا پارٹیشن تھا۔ کمرے میں دو گاڈریج کی الماریاں تھیں، گہرے ہرے رنگ کا لیدر صوفہ تھا۔ کتابوں کی خاصی بڑی الماری اور لکھنے پڑھنے کی میز اور کرسی۔ ہر چیز قیمتی تھی، اگرچہ کسی قدر پرانی۔ کمرہ علی رضا والے کمرے جیسا ہی تھا۔ اتنا ہی لمبا چوڑا مگر دونوں کی ترتیب و تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دیواروں پر چند ہی تصویریں تھیں، مگر سب کی سب ایسی کہ جنہیں ایک ہی نظر دیکھتے ہی صاحب خانہ کے بلند ذوق و شوق کا پتہ چلتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھی خاصے بھاری اور قیمتی پردے ٹنگے تھے۔

عورت چائے لے کر آگئی۔ چائے کے ساتھ اس نے درجن بھر کباب بھی سینک لیے تھے ٹرے میں چار پیالے تھے۔

چوتھا پیالہ کس کے لیے تھا۔ یہ ہم پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی۔ اور ایک صاحب اندر تشریف لے آئے۔ انھیں دیکھتے ہی ہم دنگ رہ گئے۔ یہ وہی دوپہر والے حضرت تھے، مگر پتلون اور بش شرٹ میں ان کی شخصیت اب قطعی دوسری تھی۔

چھوٹتے ہی چہکے "ارے رضا صاحب! آپ ہیں ؟"

محترمہ نے نووارد کو ہم سے متعارف کراتے ہوئے فرمایا، "یہ ہریش بابو ہیں، فلموں میں کام کرتے ہیں۔"

جواب میں ہریش بابو مسکرائے اور محترمہ کی طرف دیکھ کر بولے "ان سے تو آپ مل ہی چکے ہیں۔ آپ سعیدہ بیگم ہیں۔ آپ کی ہم وطن اور آپ ہی کی طرح سعید زادی بھی۔"

ہم لوگ کوئی گھنٹہ بھر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ فلموں کی باتیں، ادب و آرٹ، مقامی سیاست اور گرد و نواح کی باتیں۔

ہریش بابو اور سعیدہ بیگم دونوں خاصے پڑھے لکھے، ذہین اور سلجھے ہوئے مذاق کے بڑے لوگ تھے۔ جنہیں ناشناس زندگی نے چھوٹے لوگوں کی طرح جینے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ میاں بیوی تھے یا بن بیاہے ہی میاں بیوی کی طرح رہ رہے تھے۔ جو بات ہم سے پوچھتے نہ بنی تھی وہ آخر علی رضا نے پوچھ ہی لی۔ جواب میں ہریش بابو مسکرائے۔

"میں نے ان کی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے مذہبی عقاید میں کبھی مخل نہ ہوں گا اور اپنا نام بھی تب تک نہ بتاؤں گا جب تک کہ یہ نام واقعی اس قابل نہ ہو جائے، لہٰذا یہ آج تک سعیدہ بیگم ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آج تک کسی قابل نہ ہو سکا، میں دس برسوں سے فلموں میں ہوں۔ سبھی مجھے اچھا ایکٹر مانتے ہیں مگر آج تک مجھے کوئی ایسا رول نہیں ملا جو مجھے وہ مقام دلا سکتا جس کا میں حقدار ہوں۔ سوائے پولیس افسر اور جج کے میں نے آج تک کوئی کردار نہیں کیا۔ حالانکہ ——————" وہ یکایک رُک گئے۔ ہم نے دیکھا کہ محترمہ بھی کچھ کہنا چاہتی ہیں۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" پھر رضا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

"رضا صاحب، یہ غلط فرما رہے ہیں، میرا نام 'سعیدہ ہریش' ہے۔ اور یہ میں پورے فخر سے کہہ رہی ہوں۔" ان کے لہجہ میں پیار بھری شکایت تو تھی ہی وہ یقین بھی تھا جو اپنی کہی منوا لینے کا دم رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

ہم کوئی دو گھنٹہ بعد لوٹے تو آتے ہی کپڑے بدل کر لیٹ گئے۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

آخر ہم سے رہا نہ گیا۔ "تم سوچ رہے ہو کہ اس عجیب و غریب جوڑے کے بارے میں جو واقعہ ہم نے تمہیں ابھی ابھی سنایا تھا من گھڑت تھا۔"

"نہیں۔" رضا کا جواب مختصر تھا۔

ہم دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"تم تحت الشعور کی ہیبتناک طاقتوں کے قائل ہو کہ نہیں۔"

"تو تم؟"

"آدمی کے ذہن کے تہہ خانوں میں نہ جانے کیا کیا چھپا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے

جو دیکھا، یعنی تم جو سمجھتے ہو کہ تم نے واقعی دیکھا تھا، وہ تم نے دراصل دیکھا نہ ہو۔ وہ سب تمہارا تصور یا کوئی خواب آوارہ ہی ہو۔"

ہمیں غصّہ آرہا تھا۔ "ہم نہ صرف جاگ رہے تھے علی بابا بلکہ باقاعدہ کام کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں یہ ہم نے ہی نہیں، تم خود اعتراف کر چکے ہو کہ ہم سے پہلے عباس میاں اور مجروح صاحب نے بھی۔"

"کبھی کبھی آدمی جاگتے جاگتے بھی سویا سویا سا ہوتا ہے۔ اب تم خود ہی غور کرو تم کس طرح اچانک اس کمرہ میں داخل ہوئے۔ ایک بار اندر آ گئے تو لوٹ نہ سکے کیونکہ اس طرح کمرے کو کھلا اور بے سہارا چھوڑ کر چلے جانا تمہاری نظر میں مناسب نہ تھا۔ اب تم کمرے میں اکیلے تھے، تمہارے سوچ کی اُڑان تمہیں کہیں بھی لے جا سکتی تھی۔ اب اس حالت میں یا تو تم کوئی ایسی شعوری حرکت کرتے جو تمہارے لیے بغیر کہیں جائے ممکن ہوتی یا پھر تم سے دوسرے عامیانہ کام کراتی۔ آدمی کا شعور اسے اپنے غیبی ساتھیوں یعنی تحت الشعور اور لاشعور کے حوالے بھی کبھی کبھی کر دیتا ہے"

"بکواس بند کرو" ہمیں اب واقعی غصّہ آرہا تھا۔

میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بول رہے، مگر ہم دونوں نے ابھی ابھی تمہاری کہانی کے جن دونوں کرداروں کو دیکھا ہے، وہ کیا ــــــ؟"

یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو دیکھا، وہ درست تھا، مگر جس کیفیت کا تم ذکر کر رہے ہو وہ ہماری بجائے اس وقت اُن دونوں پر طاری تھی ــــــ

ہو سکتا ہے۔ آدمی واقعی بڑی خبیث شے ہے۔ البتہ مناسب یہی ہے کہ ہم اب مان لیں کہ

خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا ــــــ
جو سُنا، افسانہ تھا ــــــ

مہک

بوڑھی خادمہ نسرین دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھی۔ جھجکتے جھجکتے ذرا سا پردہ سرکا کر اندر جھانکا اور بڑی عاجزی اور انکساری سے ڈری سہمی آواز میں اطلاع دی "ایک مریضہ آئی ہے ڈاکٹر صاحبہ"

ڈاکٹر نیلیما جو گئی رات شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک ایک بڑی ہی مکروہ صورت مجرمہ کے بدنما اور بھرپور شکم سے خاصی بڑی رسولی کے اخراج سے بغیر دم لیے الجھی رہی تھی آج صبح کافی دیر سے اٹھنے کے باوجود خاصی تھکی تھکی۔ ٹوٹی ٹوٹی سی محسوس کر رہی تھی، رات وہ وہسکی کے چار بڑے پیگ حلق میں یکے بعد دیگرے انڈیل کر سوئی تھی تاکہ شام کی اس منحوس تھکاوٹ سے کچھ نجات ملے ——

نجانے کس منحوس گھڑی میں اس نے مقامی جیل کے زنانہ وارڈ کی مجرم مریضاؤں کی نگرانی کا ذمہ قبول کر لیا تھا۔

جرم و سزا کی الجھنیں۔ میری اپنی زندگی ہی کون ایسی .....

وہ اپنے چوتھے بلیک کافی کے پیالے اور ساتویں سگریٹ سے دل ہی دل میں محو گفتگو تھی۔

بوڑھی نسرین کی بیجا مداخلت اسے اچھی نہیں لگی

تم تو جانتی ہو بڑی بی کہ میں کتنی تھکی ہوئی ہوں۔ سوچا تھا آج اتوار ہے۔ پورا دن آرام کروں گی۔ ابھی تو میں نے منہ بھی نہیں دھویا" کچھ دیر نسرین چپ رہ کر بولی "مگر ڈاکٹر صاحبہ، یہ بڑا پیچیدہ اور غیر معمولی کیس ہے۔ یہ بچی ....."

نیلیما جیسے خواب سے جاگ اٹھی ہو۔ کیا کہا تم نے —— "بچی؟"

ہٹلر بھی تو عیسیٰ ہی کی بھیڑ ہے۔

بھیڑ نہیں بھیڑیا۔

وہ بھی تو دنیا کو سود خور یہودیوں سے بچانے کے لیے آیا ہے۔

سود لینا یا دینا اسلام میں منع ہے۔

ہم مسلمانوں کا بھی دعوا ہے کہ آدمی خدا کی ساری تخلیقات میں افضل ہے اشرف المخلوقات، عیسیٰ، موسیٰ، محمدؐ اور رام اُس ایک خدا کے جُدا جُدا روپ ہیں جس نے ہم سب کو بنایا ہے۔ یہ نرنارائن دھیہ چوراسی کی سب سے افضل اور آخری منزل ہے۔ پنڈت جی نے سمجھایا۔ آدمی اِس سے بچ کر نکل گیا تو سمجھ لو مُکتی پا گیا۔

ڈیم اِٹ، اِٹ از مائی ٹرن۔

لائن میں پیچھے کھڑے سردار جی کو آگے بڑھتے دیکھ کر لائن میں آگے کھڑے آسٹریلین گورے نے اُسے کالر سے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔

میں کوئی لائن تھوڑے ہی توڑ رہا تھا پہلوان۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ بیڈ نمبر پانچ کا وہ دُبلا سکڑا مردود جانے کیا کھا کر آیا ہے جو ابھی تک نبٹا ہی نہیں۔ اس بیچ دو پور جا چکے ہیں۔

ساری لائن قہقہوں سے گونج اٹھی۔

گورا سپاہی بھی مسکرا دیا۔

سالا ہندوستانی۔ یہاں بھی کرتب دکھانے سے باز نہیں آتا۔

دوسرا گورا بولا "یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ سالے کے اندر کچھ ہو ہی نا۔"

ایسا ہوتا تو وہ عورت مستی میں نہ پڑی رہتی۔

تیسرا بولا۔ "لو وہ آگیا۔"

پنڈت جی نے کہا۔ جو آتا ہے جاتا بھی ہے۔ ہر چیز پیدا ہوتی ہے بڑھتی پھیلتی

جی ہاں ڈاکٹر صاحبہ۔ بالکل بچی بمشکل تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ دیکھنے میں اس سے بھی چھوٹی لگتی ہے۔ بالکل گڑیا سی۔ میں نے بہت کوشش کی، بہت سمجھایا، ذرا ڈرایا دھمکایا بھی مگر میں کچھ نہ کر سکی، معلوم ہوتا ہے آپ کو جانتی ہے۔ بس ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہے آنٹی سے ملا دو۔ آنٹی سے ملا دو۔ اس کا اس طرح چیختے چلاتے روتے جانا مجھ سے قطعی برداشت نہ ہو سکا تو مجبوراً ——————

تم نے نام نہیں پوچھا ؟

پوچھا تھا مگر جواب میں وہ صرف روتی رہی۔ کہہ رہی تھی اس کے پاس یہی چند گھنٹے ہیں

نیلیما نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور سگریٹ بجھا دیا۔ "تم نے پوچھا تو ہوگا کہ کیا مرض ہے" ؟

بہت پوچھا مگر جواب میں وہ صرف روتی رہی۔ مجھے لگتا ہے بچی پاؤں سے بھاری ہے۔

بچی، تیرہ، چودہ سال کی نوعمر بچی، پاؤں سے بھاری، کیا بک رہی ہو ؟ ڈاکٹر نیلیما کے اندر کا ڈاکٹر ایک دم ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا "بچی۔ تیرہ چودہ سال کی بچی۔ لعنت ہے اس مغربی فضا پر" وہ ہڑبڑاتے اندر چلدی۔ "میں ابھی آتی ہوں تم اسے کنسلیٹشن روم سے لے جا کر سیٹی پر لٹا دو۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے وہ واپس لوٹی تو دیکھا کہ ڈاکٹر کے کنسلیٹشن روم میں جانے کی بجائے نجمہ وہیں فائیر میں سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اور گردن جھکائے بدستور روئے جا رہی ہے۔

ارے تم نجمہ ؟

نجمہ نے اعتراف گناہ سے سر کو اور بھی جھکا لیا ——————

کیا بات ہے بیٹی ؟

بیٹی کا پیار بھرا لفظ سن کر نجمہ ایک دم پھوٹ پڑی

نیلیما نے مصنوعی ناراضگی کا آڈمبر بھرتے ہوئے دھمکایا۔ تم رو دھو کر تھک جاؤ تو مجھے بلا لینا۔ میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے ——————

پلیز آنٹی !!

یہ ہوئی نا بات۔ ڈاکٹر کے دواخانہ میں آئی ہو تو اسی طرح بات کرو جس طرح مریض

کرتے ہیں، اور بتاؤ کہ تمہیں کیا تکلیف ہے اور تم اکیلی کیوں آئی ہو۔ تمہارے ابّو کہاں ہیں؟۔
وہ برمنگھم گئے ہیں۔
تمہیں کیا تکلیف ہے۔
میں آنٹی ـــــ میں ـــــ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب کے ڈاکٹر نیلیما کو غصہ نہیں آیا۔ بڑی شفقت سے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور تسلی دیتے ہوئے اس نے پوچھا "بات کرو بیٹی۔ بولو گی نہیں تو میں کوئی بجومی تو ہوں نہیں، جو جان جاؤں گی کہ تمہارا مرض کیا ہے۔ کیسا درد ہے، کہاں ہے، کتنا ہے۔ تمہیں بھولنا نہیں چاہیئے بچہ کہ میں اس علاقے کے دوسرے لوگوں کے لیے بھلے ہی محض ایک ڈاکٹر ہوں مگر تمہاری تو آنٹی بھی ہوں۔ تمہارے ابّو میرے منھ بولے بھائی ہیں۔
"جبھی تو آنٹی"، مگر آنسو تھے اس معصوم بچی کے جو تھمتے ہی نہ تھے۔
بالآخر ڈاکٹر نے حکم دیا۔ جوتے اتارو، کوٹ اتارو، یہ پل اوور قمیص بھی اتارو اور دم سادھ کر ایک دم لیٹ جاؤ اس سیٹی پر۔
بچہ نے مزید کوئی آرگیومنٹ نہیں ڈالی۔ آنکھیں موند کر جیسے کہا گیا تھا ویسے ہی لیٹ گئی۔
آج صبح تم نے کچھ کھایا پیا بھی کہ نہیں۔
بچہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں البتہ بدستور بند رہیں۔
آنکھیں موندے ننگ بدن سیٹی پر لیٹی وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ کافی دیر تک قسم قسم کے اوزاروں سے پوری کلینیکل جانچ پڑتال کے بعد ڈاکٹر مسکرا دی۔
بدمعاش لڑکی، تو نے تو مجھے ایک دم ڈرا دیا تھا۔ اللہ کے فضل سے تم بالکل اچھی اور ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔
مگر وہ بچہ؟
کون بچہ؟
جو میرے پیٹ میں ہے۔
کیا بک رہی ہو؟
بک نہیں رہی ہوں آنٹی۔ اللہ قسم سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ دن رات میرے پیٹ میں اچھلتا کودتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی عجیب و غریب آوازیں بھی نکالتا ہے۔ خدا گواہ ہے آنٹی کہ میں

ہی جانتی ہوں اس نٹ کھٹ کی شرارتیں۔ اس کی اچھل کود اور کلکاریوں کی وہ عجیب غریب آوازیں جو دن رات میرے کانوں میرے سارے بدن کے رگ و پے میں ہلکے ہلکے گدگدا کرتی ہیں۔ اب تو یہ راز چھپانا جان لیوا ہوتا جا رہا ہے آنٹی، میں جانتی ہوں یا میرا خدا کہ کیسے کیسے جتنوں سے دبائے رکھتی ہوں اس کی یہ حرکات۔ مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔

نیلیما مسکرائی۔ تمہارے اندر کچھ نہیں ہے نجو۔ تمہاری یہ ساری پریشانی بیجا ہے مگر آنٹی!!

وہم کا کوئی علاج نہیں۔ پھر کچھ سوچ کر ڈاکٹر نیلیما نے کہا۔ غالباً ایک علاج ہے بھی، بشرطیکہ تم دل و جان سے اور اللہ و رسول کی قسم لے کر کہو کہ جو بات میں پوچھوں گی، تم اس کا جواب دو گی۔ سچ بولو گی اور سچ کے سوا کچھ نہ بولو گی۔

میں نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا آنٹی۔ آج تک صرف اسی ایک راز کو چھپا کر رکھا ہے دنیا سے۔ تمہارے سامنے یہ بھی ظاہر کر دیا آج۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گی اور تم جو بھی پوچھو گی سچ سچ بتاؤں گی۔

یہ کب سے ہے؟

کیا؟

یہی سب۔ یہ کیفیت جو تم بیان کر رہی ہو

آٹھ سال سے!

کیا کہا!!

ٹھیک کہتی ہوں آنٹی۔ آج پورے آٹھ سال ہو گئے اسے۔

کیا بکتی ہو۔ بچہ تین مہینے کا ہو تو عورت کا پیٹ پھول کر فٹ بال بن جاتا ہے جبکہ تمہارا پیٹ ریڑھ کی ہڈی سے چپکا ہوا ہے۔

میں کوئی عورت تھوڑے ہی ہوں آنٹی۔ ابھی تو میں اتنی چھوٹی ہوں اور پھر میں نے کہا نہ آنٹی کہ میں نے اسے زبردستی دبا کر رکھا ہوا ہے۔ تم تو جانتی ہو آنٹی ابو کا غصہ۔

تم جانتی ہو بچہ کیسے ہوتا ہے؟

جانتی ہوں آنٹی!

تو پھر بتاؤ۔ تمہارے بیٹے کا باپ یعنی تمہارا مرد کون ہے

رشید!

کیا کہا؟ رشید؟ تمہارا چھوٹا بھائی وہ تو ابھی دس سال کا بھی نہیں ہوا۔

کل اس کی سالگرہ ہے۔ ابو اسی لیے برمنگھم سے سیدہ آنٹی کو لینے گئے ہیں۔ کل وہ پورے نو سال کا ہو جائے گا۔

لندن جیسے آزاد اور کھلی فضا والے شہر میں یہ دقیانوسی مسلمان اپنی اکلوتی بیٹی کو جس طرح گھر میں ہر دم بند کئے رکھتے ہیں اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ تو ظاہر ہے کہ آخر نکلنا ہی تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ رشید بمشکل نو برس کا ہے اور یہ خود تیرہ یا چودہ سال کی ہوگی۔ پچھلے آٹھ سال سے یقیناً بچی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے ——

یہ کب سے چل رہا ہے۔

کہا نا آنٹی کہ پچھلے آٹھ سال سے۔

یعنی وہ ابھی دو ہی سال کا تھا تب سے۔

دو سال کیوں آنٹی۔ جیسے ہی وہ سال بھر کا ہوا تھا امی نے اسے میرے ساتھ سلانا شروع کر دیا تھا ——

تو خود تب کتنے سال کی تھی۔

یہی کوئی پانچ چھ سال کی۔ بڑا مزہ آتا تھا اسے ساتھ سلانے میں۔ وہ بستر پر پیشاب کر دیتا تھا تب بھی مجھے برا نہ لگتا تھا۔

جانتی ہے بچہ کیسے ہوتا ہے!

جب کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ سوتی ہے

مرد؟

آپ بھی عجیب ہیں آنٹی رشید مرد ہی تو ہے اور میں چھوٹی عمر کی سہی مگر ہوں تو عورت ہی۔ رشید میرے ساتھ پورے آٹھ سال سے سو رہا ہے۔

تم بھائی بہن ہو تمہارے ایک ساتھ سونے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر محض ساتھ ساتھ سو جانے سے ہی تو کچھ نہیں ہو جاتا۔ رشید بچہ ہے اور ماشاء اللہ تم خود بھی —— اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ——

میں سب جانتی ہوں آنٹی۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ بیچارے رشید کا قصور نہیں، سارا دوش میرا اپنا ہے۔ رشید کتنا گول مٹول پیارا پیارا بچہ ہے۔ میں ان پچھلے آٹھ سالوں میں ہر رات اس کو اپنے اوپر لٹا کر سوتی رہی ہوں۔ پیار آتا تھا تو زور سے بھینچ بھی لیتی تھی۔ مینے اکثر محسوس کیا ہے کہ وہ میرا بیٹا ہے ـــــ مگر

مگر کیا؟

میری نہ بتاتی تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ اسے اس طرح ساتھ چمٹائے رکھنے اور اس طرح بھینچنے اور والہانہ پیار کرنے سے اس کا کچھ نہ کچھ دھیرے دھیرے میرے پیٹ میں بھی جاتا رہے گا۔ اب تو آنٹی تھوڑا تھوڑا کر کے ایک آسیبی سایا سا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ اسی کا ہے، میرے اندر جم کر بیٹھ گیا ہے۔ میری روز میرا مذاق اڑاتی ہے آنٹی کہتی ہے رشید تیرا بھائی بھی ہے اور بیٹا بھی، تیرے ہونے والے بیٹے کا باپ بھی۔ میں بہت پریشان ہوں آنٹی۔ کل سعیدہ آنٹی آ رہی ہے اور آپ تو جانتی ہی ہیں اسے۔ بڑی تیز نظر ہے اس کی ایک نظر دیکھتے ہی جان لے گی کہ میں پیٹ سے ہوں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے سے میرا نکاح کرنا چاہتی ہے۔ اماں اور ابو بھی یہی چاہتے ہیں، میں خود بھی خلیق بھائی کو بے حد پسند کرتی ہوں۔ سب کا سب چوپٹ ہو جائے گا۔ یہی ایک دن بچا ہے آنٹی مجھے بچا لو۔ میرا پیٹ خالی کر دو۔ آسانی سے ممکن نہ ہو تو آپریشن ہی کر ڈالو میرا۔ تم تو ڈاکٹر ہو۔ تم اسے اپینڈیسائی ٹسٹ ایسی کیسی نامراد سی بیماری کا نام دے کر بھی یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہو۔

ڈاکٹر اب واقعی پریشان ہو گئی بالآخر مجبور ہو کر اس نے پوری تفصیل سے نجمہ کو سمجھایا کہ حمل کیسے ہوتا ہے بچہ کیسے پیٹ میں آتا اور جنمتا ہے۔ سمجھاتے سمجھاتے وہ ایک ڈاکٹر ہو کر بھی خود شرم و حیا سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی، مگر نجمہ پر اس کی کسی بات کا اثر نہ ہو رہا تھا تم سمجھتی کیوں نہیں ہو نجمی۔ تم ایک کنواری لڑکی ہو۔ تمہارے ساتھ آجتک ایسا کچھ نہیں ہوا جس سے بچہ ہوتا ہے۔

میں نے کب کہا ہے آنٹی کہ مجھے بچہ ہو گیا ہے۔ میں تو آپ کو بس اتنا ہی سمجھا رہی ہوں کہ میرے پیٹ میں بچہ ہے، جو جیسا بھی ہے جیسے بھی ہوا ہے دنیا کی نظر میں ناجائز ہے، مجھے بچا لو میری اچھی آنٹی نہیں تو میں ٹیمز میں کود کر جان دے دوں گی۔

میں نے پوری جانچ پڑتال کر لی ہے۔ تم ایک نابالغ کنواری بچی ہو ـــــ سو فی صدی

کنواری۔

نجمہ ایک لمحہ کے لیے رکی، پھر بولی "کیا میری کنواری نہ تھی؟"

میری کون؟

کرائسٹ کی ماں۔ کنواری مریم جو ایک فرشتہ تھی۔ میں تو ایک معمولی مسلمان ہوں، اس نے خدا کے بیٹے کو جنما تھا جس کی مبارک پیدائش پر چاروں دشاؤں کے حکمراں اور علماء، سینکڑوں میلوں کا سفر طے کر کے آئے تھے۔ مریم کو مبارک دینے اور اس کے فرشتہ بیٹے کو خوش آمدید کہنے۔ ساری دنیا کے علماء، وفضلاء، نے میری کے حضور میں سرنگوں ہو کر بنی نو کے نجات دہندہ کی ولادت پر عقیدت کے بیش قیمت تحائف پیش کیے تھے، دیوتاؤں نے آسمانوں سے پھول برسائے تھے۔

یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟

سسٹر سانڈرہ نے جو ہمیں تواریخ پڑھاتی ہیں۔ مگر وہ ایک اور یگ تھا۔ آج اس قسم کا حادثہ پیش آیا ہوتا تو لوگ میری کا سر قلم کر دیتے، یا رسوا کر کے اسے گھر بدر کر دیتے۔ میرے والد ذات کے قریشی ہیں، طبیعت کے بھی متعصب ہیں۔ میری بتا رہی تھی اور کنتی بھی جو ہماری کلاس فیلو ہے کہ اس طرح کے بچے بڑے اہم ہوتے ہیں جیسے عیسیٰ مسیح تھے، پانڈو تھے، مہان ویر کرن تھے اور ہمارے اپنے دور کے سب سے بڑے انسان مہاتما آئینسٹائن۔ میری کہتی ہے میں گھر سے بھاگ جاؤں۔ کنتی کا بھی یہی مشورہ ہے کیوں کہ میرا بچہ بھی یقیناً کوئی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہوگا، مگر میں کیسے بھاگوں آنٹی۔ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ میرے ابو تو مجھے سمندر کی تہہ سے بھی برآمد کریں گے۔

تو یہ بات ہے؟ اب ڈاکٹر نیلما کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی نجمہ کہتی گئی۔ دوزی بتا رہی تھی.......

دوزی کون؟

وہ بھی میری ایک سہیلی ہے

کیا بتا رہی تھی دوزی!

یہی کہ کرائسٹ کی پیدائش سے پہلے میری کو عجیب و غریب خوشبوئیں آیا کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ خوشبوئیں کنواری میری کے اندر سماتی چلی گئیں اور آخر کار ایک بچہ بنکر بیٹھ

گئیں اس کے پیٹ میں۔ میرے ساتھ بھی آنٹی بالکل وہی ہو رہا ہے۔ رشید کے جسم کی ساری بُو باس میرے جسم نے جذب کر لی ہے۔ میں سوتی ہوں تو وہ جاگتا ہے۔ میں جاگتی ہوں تو وہ سوتا ہے۔ میں ڈھنگ سے نہ سو سکتی ہوں نہ جاگ سکتی ہوں۔ اپنا یہ راز چھپانے کے لیے مجھے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا آنٹی۔ میں ہی جانتی ہوں اپنا یہ دکھ۔ مجھے بچا لو میری اچھی آنٹی، میں عمر بھر تمہارا یہ احسان نہ بھولوں گی۔

تم نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے بجی۔ میرا علم کہتا ہے کہ تمہیں کچھ نہیں مگر میں تمہاری بات کو بھی جھٹلانے سے قاصر ہوں میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا ——

آپ چاہو تو اپنی کسی دوست، کسی دوسری ڈاکٹر سے مشورہ کر لو مگر جو کرنا ہے ابھی کرو آج ہی سب کر ڈالو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا وقت آ پہنچا ہے۔ کئی دنوں سے مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے جلد ہی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ کون جانے کب کیا ہو جائے۔ کون جانے جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے۔ کون جانے میری عزت بچانے کے لیے ہی امی ابو آج گھر میں نہیں ہیں

کیا ہونے والا ہے؟ تمہیں کیسا لگتا ہے؟

دوزی کہہ رہی تھی بچہ پیچھے ہوتا ہے۔ اللہ اس کی خوراک پہلے پیدا کر دیتا ہے۔ اب دیکھیے نہ آنٹی میری چھاتی کے یہ گول، گول ابھار۔ کتنے بھدّے لگتے ہیں۔ ہاتھ تک لگانے سے درد ہوتا ہے۔ میٹھا میٹھا۔ دوزی بتا رہی تھی یہ دودھ کے دو کٹورے ہیں۔ میرے ہونے والے بچے کی خوراک ——

یہ تو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں تم انھیں بھدا کہتی ہو تمہارے سینے کے ابھار تو تمہاری اُمڈتی ہوئی چنچل جوانی کی شوخ نشانیاں ہیں۔ میری طرف دیکھو۔ میرے بھی تو ہیں —— مگر مجھے ——

یوں تو یہ دوزی کے بھی ہیں اور میری اور کنتی کے بھی۔ مگر

مگر کیا؟

وہ تینوں کبھی کسی کے ساتھ نہیں سوتیں اور ابو امی سے کہہ رہے تھے۔

کیا کہہ رہے تھے تمہاری امی سے تمہارے ابو؟

مجھے شرم آتی ہے۔ آپ خفا ہو جائیں گی۔

کیوں ایسی کیا بات ہے ؟

وہ کہہ رہے تھے

ارے بھئی کہہ بھی چکو نا !

کہہ رہے تھے ڈاکٹر نیلیما بھی خوب ہے ۔ اسے دیکھ کر کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ وہ ایک عورت ہے ۔ اور کہہ رہے تھے

کہو کہو ! !

کہہ رہے تھے ، میرا ایمان کہتا ہے کہ ڈاکٹر نیلیما نے آج تک کسی غیر مرد کے ساتھ ہم بستری نہیں کی ہے پھر پوری عورت ہوتے ہوئے بھی وہ ایک کنواری لڑکی کی طرح ہے ۔

ڈاکٹر نیلیما نے ندامت سے سر جھکا لیا ۔ اور پھر جیسے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ۔

تم انڈہ میٹ تو کھاتی ہو نا ؟

جی نہیں آنٹی ۔ زیادہ کھانے سے پیٹ پھول جاتا ہے ۔ ابو کہہ رہے تھے کسی بھی کنواری لڑکی کو انڈہ میٹ وغیرہ نہ کھانا چاہیئے ۔ وہ آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے ۔ کہہ رہے تھے اتنی جوان ہے ڈاکٹر نیلیما مگر بحال ہے جو دوسری ہندوستانی پروفیشیل عورتوں کی طرح کبھی کسی غیر مرد کے پیچھے بھاگی ہو ۔ جسم کو مریادہ میں رکھنے کے لیے وہ کبھی کوئی گرم چیز نہیں کھاتی جبکہ لندن میں مقیم ہندوستانی عورتیں ، انڈے میٹ تو ایک طرف سگریٹ اور شراب تک کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں ——— ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے ۔ میں ایک جینی عورت ہوں ۔ میرے مذہب میں ان اشیاء کی ممانعت ہے مگر تم تو مسلمان بچی ہو ۔ تمہارے مذہب میں تو یہ سب جائز ہے ۔ تم خوب بھر پیٹ کھایا پیا کرو یہ سب ۔ لندن کی آب و ہوا میں انڈا میٹ مچھلی سب جائز بلکہ ضروری ہیں ——— لندن میں کون پرواہ کرتا ہے ، مذہب کی آنٹی ، ابو شراب پیتے ہیں ۔ پورک بھی کھاتے ہیں جب کہ ہمارے مذہب میں یہ دونوں اشیاء حرام ہیں ۔ مگر تم میری باتوں کو اگنور کر رہی ہو آنٹی ! !

نہیں نجی ۔ میں نے تمہارا مرض سمجھ لیا ہے بلکہ سمجھ لو کہ ایک دم پکڑ لیا ہے ، میں تمہارے جسم سے تمہارا بچہ اس طرح خارج کر دوں گی جس طرح یہ اس میں داخل ہوا ہے ۔ تم ذرا فکر نہ کرو اور سب کچھ اپنی آنٹی پر چھوڑ دو ۔ میں تمہیں چند گولیاں دوں گی جنہیں تم ہر روز صبح و شام کھانے کے

بعد چھلکے سے نگل لیا کرنا۔ تم دیکھو گی کہ چند روز میں ہی تمہارا یہ بچہ خون کی چھوٹی چھوٹی پوٹیاں بن کر اپنے آپ خارج ہو جائے گا تمہارے پیٹ سے، اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی، نہ تمہارے امی ابو کو نہ تمہاری سعیدہ آنٹی کو ہی ——— تم بے فکر ہو کر گھر چلی جاؤ اور سنو جتنی جلدی ممکن ہو میری، کنتی اور دوزی سے ملنا جلنا ترک کر دو۔ یہ دوا سے بھی زیادہ ضروری ہے ان کو تو کسی صورت بھی نہ بتانا کہ تم کوئی دوا کھا رہی ہو۔

وعدہ ؟

وعدہ !

نجمہ کے سر سے جیسے سارا بوجھ اتر گیا۔ دوا لے کر وہ گھر چلی گئی۔ پندرہ بیس روز بعد وہ آنٹی سے ملنے آئی تو بے حد مسرور تھی۔

تم ٹھیک کہتی تھیں آنٹی۔ بالکل ویسے ہی جیسا تم نے بتایا تھا، میرے اندر سے خون اپنے آپ پھوٹ پڑا ہے۔

نیلیما مسکرائی۔ مبارک ہو نجمہ تمہارا پیٹ اب ایک دو دن میں اپنے آپ صاف ہو جائے گا۔

دو چار روز بعد نئے کپڑے پہن کر نجمہ آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک بہت بڑا ڈبہ تھا۔ آج وہ بہت مسرور تھی۔

آج میں کتنا ہلکا ہلکا محسوس کر رہی ہوں آنٹی۔ آج عید ہے نا، ابو نے بھیجی ہے یہ مٹھائی اور دیکھو۔

انگوٹھی ؟ ہیرے کی ہے غالباً ؟

خلیق بھائی نے دی ہے ———

اب تم سعیدہ آنٹی کے بیٹے کو بھائی نہ کہا کرو۔ وہ تمہارا منگیتر ہے۔

نجمہ شرما کر بھاگ گئی مگر پھر جلد لوٹ بھی آئی۔ وفورِ مسرت سے اس نے اپنی نیلیما آنٹی کو النگن میں لے کر چوم لیا!

اور "تھینک یو آنٹی" کہہ کر ہرنی کی طرح کلانچیں بھرتی ہوئی بھاگ گئی۔

پریم ناتھ کی بہو کا گھر آنا تھا کہ ماسٹر شادی لال کے دن پلٹنے لگے۔ پریم ناتھ ایم اے ہوتے ہوتے ہی ایک سرکاری دفتر میں معمولی کلرک تھا مگر شادی کیا ہوئی اس کی گویا بھاگیہ کے بند کواڑ کھل گئے اس کے اپنے ہی دفتر میں ایک اچھی اسامی نکل آئی کسی طرح اور وہ پروموشن پا گیا تنخواہ دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی پریم کے چھوٹے بھائی نہند رکی بھی نوکری لگ گئی اور ماسٹر شادی لال جو مقامی مڈل اسکول میں ریاضی کے معلم تھے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے اچانک وفات پا جانے کی وجہ سے اپنے ہی اسکول میں بیٹھے بٹھائے ہیڈ ماسٹر بنا دیئے گئے۔ گھر میں دو چار ہی مہینوں میں دو ڈھائی کی جگہ ایک دم ہی ہزار بارہ سو کی آمدنی شروع ہو گئی۔

رام دے اور بندہ لے، شادی لال تیرے بیٹے کی بہو ساکشات لکشمی ہے۔ دیکھنا تیرا لڑکا چند ہی سالوں میں بڑا افسر بن جائے گا۔ ٹھیک کہتے ہو گپتا جی۔ بہو آئی ہے تو جیسے بہار آ گئی ہے میرے گھر میں۔ کہاں تو دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا اور اب دن رات پراٹھے دودھ اور مکھن سے میری خاطر تواضع ہوتی ہے۔ نہ رہی بیچاری بھگوتی اور نہ چند اچھے دن وہ غریب بھی دیکھ لیتی۔ اپنا اپنا بھاگیہ ہوتا ہے بھیا۔ وہ غریب جب تک رہی جھوٹے برتن ہی مانجتی رہی۔ کھانا بچا تو کھا لیا نہیں تو ویسے ہی سو گئی۔

ہاں بھئی اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ ادھر اپنی طرف دیکھو بہو چار بار بھاگی بنی اور چاروں ہی بار بچاری کی اولاد جنتے ہی سورگ سدھار گئی۔ اب کے جو بچہ ہو گا اسے تیری پوتر آتما بہو کا آشیرواد دلوائوں گا تاکہ کوئی بیل تو پروان چڑھے۔

رادھے شیام گپتا کپڑے کی دکان کرتے تھے اور اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا ان کا۔ بیٹا مقامی اسکولوں کا انسپکٹر تھا۔ لائق اور کماؤ بہو تو بیچاری بالکل گانے تھی مگر تقدیر کا کوئی کیا کرے۔ اچھی بھلی اولاد ہوتی مگر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد ہی بھگوان کو پیاری ہو جاتی۔

بچے جن جن کر سیتا رانی بیچاری تھک گئی تھی مگر پانچواں بچہ پھر سے تیار تھا۔ پہلے والے تین لڑکے اور ایک لڑکی جیوت ہوتے سارے نہ سہی آدھے ہی تو کاہے کو یہ پانچواں بوجھ اٹھاتی بیچاری مگر بچہ تو ہونا ہی چاہیئے ورنہ عورت کی کیا جون

تین مہینہ بعد سیتا نے ارملا کو جنم دیا تو گپتا جی نے بچی کو لا کر کملا کی گود میں ڈال دیا۔ یہ بچی تیری ہی بہو۔ بھگوان کرے تیری ہو کر ہی جیئے۔ سیتا سے پالے پوسے گی مگر بیٹی یہ تمہاری ہی رہے گی۔ تم لکشمی ہو کملا رانی۔ آشیرباد دو اور رکھدو اپنا مبارک ہاتھ میری پوتی کے سر پر۔

کملا نے خود ابھی پورے سولہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ ارملا کو گود میں لے لیا اور ماں بن گئی ایک

اور پروان چڑھتی ہے اور ——— بالآخر مٹی ہو جاتی ہے۔

چھ باہر نکلے اور چھ اندر گھسے۔ اب ان کا معائنہ ہو رہا تھا۔ پہلی عورتیں اندر چلی گئی تھیں اور ان کی جگہ چھ تازہ دم نئی آ گئی تھیں۔ حیرت تھی کہ باہر کھڑے لوگ تو ان کو ایک ٹک گھورے جا رہے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی کسی کی طرف نہ دیکھ رہی تھی۔ وہی کیفیت جو تھیٹر کے اداکاروں اور سامعین کے مابین ہوتی ہے۔

ان ایٹیچڈ۔ پانی میں کنول کی طرح۔

کیچڑ میں کنول کی طرح

یہ پاپ اور پُنیہ سے ماورا ہیں۔

پنڈت جی سمجھا رہے تھے۔ جب کوئی عورت دو وقت کی روٹی کے لیے یا اپنے نوزائیدہ بچے کے دودھ کے لیے جسم بیچتی ہے تو اسے فاحشہ نہیں کہتے۔ دھندا، دھندا ہے۔ البتہ جب کوئی عورت سوکھی روٹی کی بجائے پراٹھے کے لیے جسم کا بیوپار کرتی ہے تو وہ حقیقتاً فاحشہ ہے۔

بیسوا۔ رنڈی۔

ان عورتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

یہ غلام ہیں۔ بکی ہوئی، خریدی ہوئی، جنس، انھیں کسی بُرے یا بھلے شبد سے نہیں بلایا جا سکتا۔

پادری نما گورے نے کہا۔ مگر خود پسند آدمی، جو خود اپنے ہی کو نہیں پہچانتا، اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا صدیوں سے اپنے ہی بارے میں بکے جا رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اس نے، مگر اس کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی شاید۔ کبھی ختم ہو گی بھی نہیں ———

بیٹی کی۔ بن جنے۔ مریم کی طرح۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا تھا گپتا پریوار کا۔ صبح صبح ہی نہلا دھلا کر اور اپنی چھاتی کا دودھ پلا کر سیتا ارملا کو کملا کے پاس چھوڑ جاتی اور رات کو جب بچی سو جاتی تو اٹھا کر لے جاتی اسے اپنے گھر بیچ بیچ دو چار بار مقررہ وقت پر آکر بچی کو دودھ پلا جاتی اور بس۔

"ماں تو تم ہو کملا رانی میں تو تمہاری بیٹی کی آیا ہوں"

ایسا کیوں کہتی ہو دیدی۔ یہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔ میری تو یہ گڑیا ہے۔ سچ کہتی ہوں دیدی۔ میرے دودھ ہوتا تو رات کو بھی اسے اپنے ہی ساتھ سلاتی۔ تمہارے منہ میں دودھ ہو گا کملا رانی۔ ایک چھوڑ دس بچے پلیں گے تمہارے کھتوں سے بھگوان کرے تم دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو۔

سیتا نے یہ دعا پورے دل سے دی تھی۔ مگر وہ جو دعائیں سنتا ہے سب کی ساری دعائیں تھوڑے ہی مان لیتا ہے۔ اس کی بھی موڈ ہوتی ہے۔ اچھی موڈ ہوئی تو چنڈال کی بھی سن لی۔ اچھی موڈ نہ ہوئی تو بڑے سے بڑے بھگت کی بھی نہ سنی۔ کملا کو سارا محلہ سراہتا تھا ماسٹر شادی لال اور دیور مہندر تو اس پر جان چھڑکتے تھے کوئی اس سے ناخوش تھا تو پریم ناتھ۔ اس کا پتی پرمیشور۔

پریم ناتھ ایم اے پاس تھا اس کی بیوی کم از کم بی اے پاس تو ہونی ہی چاہیئے تھی بھلے ہی تھرڈ ڈویژن میں مگر کملا بیچاری میٹرک پاس بھی نہ تھی۔ پریم ناتھ گورا چٹا تھا اور کملا سانولی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کملا باقاعدہ پڑھی لکھی نہ ہوتے ہوئے بھی ساہتیہ کویتا ایسی بے تکی باتوں میں بڑے جی جان سے حصہ لیتی تھی۔ کہانی ناول، کویتا ایسی خرافات پریم ناتھ کو قطعی ناپسند تھیں۔ وہ ریاضی کا طالب علم تھا اور ریاضی کے علاوہ ہر دوسرے سبجیکٹ کو دماغ کا خلل مانتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ کملا کے دہلیز میں قدم رکھتے ہی ان کے گھر کا بھاگیہ چمک اٹھا تھا مگر کملا جہیز میں خود تو کچھ بھی نہ لائی تھی اور اس کے اپنی ہی قماش کے کچھ دوستوں نے پھبتی کسی تھی کہ وہ کہیں بھی شادی کرتا تو بہتر بیوی اور بہت بہتر جہیز پاتا۔ چار پیسے تو ضرور آنے لگے تھے مگر اب بھی ان کے گھر میں نہ صوفہ تھا نہ ریڈیو نہ کوئی ڈھنگ کا پلنگ ہی۔

روپیہ جو آتا تھا خرچ ہو جاتا تھا۔ ماسٹر شادی لال کی دو لڑکیاں تھی۔ بڑی لڑکی انھوں نے اپنے ہی سکول کے ایک پرائمری ٹیچر سے بیاہ دی تھی اور چھوٹی ابھی کنواری بیٹھی تھی جس کا بیاہ کرنا تھا۔

ماسٹر جی بھی کبھی کبھی سوچتے کہ کملا کچھ جہیز لے آتی تو چھوٹی بیٹی بملا کے ہاتھ پیلے کرنے میں آسانی ہوتی مگر وہ ناشکرے انسان نہ تھے۔ بہو جہیز نہ لائی تھی مگر اچھی تقدیر تو لائی تھی، جس سے ایک ویران اجڑا اجڑا

گھر بس گیا تھا۔

پیسہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے پریم بیٹے ہماری کملا لکشمی کا اوتار ہے تو دیکھتے دیکھتے لاکھوں کا مالک بن جائے گا۔

پریم اپنے باپ کی بہت عزت کرتا تھا۔ ماسٹر شادی لال جی تھے ہی نیک سیرت انسان۔ انہوں نے بھوکے رہ کر۔ چار چار میل پیدل چل کر بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور بڑا لڑکا ہونے کے ناتے پریم نے وہ سب دیکھا تھا۔

بابو جی ٹھیک کہتے ہیں بھیا، مہندر بھی کبھی کبھی سمجھاتا اسے، بھابی ہم سب کیلئے بھگوان کا ورودان بن کر آئی ہے، آپ کو بھابی کا انادر نہیں کرنا چاہیئے۔

بملا بھی بھابی کی پیاری نند تھی۔

کمبخت جادو گرنی ہے۔ سارے گھر کو جانے کیا کھلا دیا ہے اس نے جو اس گھر کا پرنس آف ویلز ہوتے ہوئے بھی میں بھی دوسرے نمبر کی چیز بن کر رہ گیا ہوں۔

وقت گذرتا جا رہا تھا اور کملا بن گڑیا کو کھلاتی پلاتی ہنساتی بڑے مزے سے زندگی گذار رہی تھی وہ اپنے گھر میں ایسی مست تھی کہ میکے کبھی مہینوں میں کبھی کبھار ہی چٹھی پڑھ لکھ پاتی تھی۔

اس کی ودھوا ماں کبھی کبھی بیٹی کی جدائی میں دکھی ہوتی تو اس کا بھائی یہ کہہ کر بڑھیا ماں کی تسلی کرا دیتا کہ لڑکیوں کے آئے دن چٹھی نہ لکھنے کی یہی تو وجہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش ہیں اور نئے ناتیوں سے ایسی گھی شکر ہو گئی ہیں کہ انھیں میکے کی یاد ہی نہیں آتی۔

بڑھیا بیچاری خوش ہو جاتی۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ کملا اچانک بغیر اطلاع دیئے میکے میں آدھمکی۔ "انھوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ میں کالی ہوں۔ بی اے پاس نہیں ہوں۔ غریب کی بیٹی ہوں اور آپ لوگوں نے مجھے جہیز نہیں دیا۔"

گھر والوں نے جب سمجھا یا کہ شادی کے بعد لڑکی کی جگہ اس کے اپنے پتی ہی کا گھر ہوتی ہے تو وہ میکے کا گھر چھوڑنے کے لیے بھی تیار ہو گئی۔

آپ لوگ میرا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تو نہ کیجئے۔ مگر میں ایسے آدمی کے پاس خود سے نہیں جاؤں گی جو آتما کا نہیں چمڑے کا بیوپاری ہے۔ پڑھا لکھا ہو کر بھی جاہل ہے ایسا آدمی میرا دا کیوں بنے۔

سب نے لاکھ سمجھایا مگر کملا ضد پر اڑی رہی۔

بال کرشن نے سنا تو بہت دکھی ہوا۔ "دیکھو کملا شادی بیاہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ تمہارا شوہر کوئی

بڑا بزرگ نہیں۔ تمہارے دیوتا سمان سسر تیرتھ یاترا پر نہ گئے ہوتے تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ وہ چھچھورا اچھا کودا تھا تو تم ہی چپ ہو جاتیں۔ خود بخود ابلا بلا کر بیٹھ جاتا مگر تم نے مقابلے کی ٹھان لی اور بھاگ آئیں۔ یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔" مگر دادا یہ شکھشا تمہاری ہی تو ہے کہ آدمی میں جہاں سب کچھ سہہ لینے کا دم ہونا چاہیئے ظلم اور ناانصافی کے سامنے تن کر کھڑے ہونے کی شکتی بھی ہو۔ ظلم برداشت کرنا تو پاپ ہے نہ دادا۔"

"کہا تو تھا۔"

"تو پھر۔ اب بولو میں کیا کروں۔"

"سنا ہے تمہاری ایک لڑکی بھی ہے۔"

"کیا کہتے ہو دادا۔ ابھی تو چھ مہینہ بھی نہیں ہوا میری شادی کو" میرا مطلب تمہاری گود میں لی ہوئی بچی سے تھا۔"

اوہو۔ وہ ــــ اس بیچاری پر واقعی ظلم ہوا ہے مگر معصوم بچہ ہے ایک دو دن بعد بھول جائے گی اپنی اس سہیلی ماں کو۔

مگر ارملا اپنی ماں کو نہیں بھولی۔ دوسرے ہی دن بیمار ہو گئی اور ایک دم ایسی بیمار ہوئی کہ بیچاری کے مرنے کی نوبت آگئی۔ ماسٹر شادی لال تیرتھ یاترا سے واپس آئے تو بہت سٹپٹائے۔ اسی شام ہندر نے اطلاع دی کہ اس کے دفتر میں چھانٹی ہو رہی ہے جس میں اس کا بھی نام آگیا ہے۔

چند روز بعد سکول میں چوری ہو گئی۔ طلبا کے مہینہ بھر کی فیس۔ ماسٹروں کی پوری تنخواہ اور سکول کی گرانٹ کا سارا روپیہ کوئی لے اڑا۔ ساتھ ہی پریم ناتھ نے انکشاف کیا کہ ایک معمولی سی غلطی ہو جانے کی وجہ سے اس کا بڑا افسر اس سے اسقدر خفا ہو گیا ہے کہ اس نے اس کی تنزلی کا حکم صادر کر دیا ہے۔

"مگر ہم سب کیا کملاہی کی تقدیر کا کھاتے ہیں۔ ہمارے حصہ میں بھگوان نے کچھ نہیں لکھا۔"

"ہر کوئی اپنی تقدیر کا کھاتا ہے بیٹے مگر گھر کی بہو گھر کی لاج ہوتی ہے۔ گھر کی ساکھ ہوتی ہے۔ گھر کی ساکھ جاتی رہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ تم جا کر بہو کو لو لاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"اپنی خاطر نہیں تو اس معصوم بچی کی خاطر ہی لے آؤ بہو کو بیٹے۔ کہو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ ارملا کے دادا تھے جو باپ بیٹے کی اونچی بحث سن کر اوپر چلے آئے تھے۔

"آپ سب مجھے نیچا دکھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر جب تک وہ معافی مانگ کر ناک نہ رگڑے

میں اسے لینے نہیں جاؤں گا۔"

"تم وہاں چلو تو۔ وہ تو ایک طرف میں خود تمہارے پاؤں پکڑنے کو تیار ہوں۔"

آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں تاؤ جی۔ آپ سب کی یہی ضد ہے تو لو میں ہارا اور آپ سب جیتے۔ میں آپ کی خاطر اسے لے تو آؤں گا۔ مگر اسے اپناؤں گا نہیں۔

کملا لوٹ آئی۔ یہ ایک کرشمہ ہی تھا کہ دوسرے ہی دن سکول کا چوریمعہ رقم پکڑا گیا۔ مہندر نوکری پر بحال ہو گیا۔ پریم ناتھ کا افسر ترقی پا کر بڑے دفتر میں منتقل ہو گیا اور جاتے جاتے اپنی ترقی کی خوشی میں پریم ناتھ کا قصور بھی معاف کر گیا۔

ارملا ایک ہی ہفتہ میں چنگی بھلی ہو کر پھر سے کلیلیں کرنے لگی۔

زندگی پھر چلنے لگی اپنے پرانے ڈھنگ سے۔

"یہ دیوی نہیں۔ جادوگرنی ہے۔ جادوگرنی۔ مگر میں دیکھ لوں گا

پریم ناتھ نے ہار تو مان لی تھی۔ مگر دل سے نہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے وہ اجنبیوں کی طرح رہتے تھے، دو سال، تین سال، چار سال، پانچ سال بیت گئے۔

ارملا سکول جانے لگی۔ مگر اب تک بھی اس نے کملا کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

"یہ کیسا رشتہ ہے"۔ "تم تو ماں بن گئی ہو۔ مگر میں باپ نہیں بنا۔"

میں تمہارے بچے کی ماں کبھی نہیں بنو گی کیونکہ تم نے مجھ سے کبھی پیار نہیں کیا۔ میں اپنے پیٹ میں تمہاری نفرت کو سمیٹ کر نہیں رکھ سکتی۔ میں انسان ہوں حیوان نہیں ہوں۔"

تیرے جسم میں بچہ جننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

کون جانے نقص مجھ میں ہے یا تم میں۔"

گالی دیتی ہے حرام زادی۔"

گالی نہیں دیتی۔ تمہیں سچی بات بتا رہی ہوں۔"

کملا نے بالکرشن کو لکھا۔

ہاں دادا میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ وہ تمہیں بھی اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔ تم نے میرے لیے جو دوا بھیجی تھی وہ اس نے مجھے پینے نہیں دی۔ اٹھا کر باہر کوڑے میں پھینک دی۔ اچھا ہی ہوا۔

مجھے بچہ وچہ کچھ نہیں چاہیئے۔ میرے لیے ارملا ہی کافی ہے۔

یہ آدمی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ اپنے جسم کی بھوک مٹانے کی خاطر مجھ سے کسی طرح نبھائے جا رہا ہے

مجھے ایک مشین کی طرح استعمال کرتا ہے وہ میرے بچے کا باپ بننے کا حق نہیں رکھتا۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں میں عورت ہوں کہ ویشیا میں تو ویشیا سے بھی بدتر ہوں۔ ویشیا کو چناؤ کا اختیار تو ہوتا ہے۔

ماسٹر شادی لال نے مرتے وقت پریم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کملا کو کبھی برا بھلا نہ کہے گا۔ اس کی عزت کرے گا اور کبھی ممکن ہوا تو اس سے بھرپور پیار بھی کرے گا۔

"تم نے اس لڑکی کو نہیں پہچانا۔ جب تک جی جان سے خود کو تمہارے سپرد نہیں کر دیتی تمہارے خون کے بچے کو اپنے اندر پنپنے نہیں دے گی۔ تمہیں اس کا دل جیتنا ہوگا بیٹے!"

اور یاد رکھنا بیوی شوہر کی عزت تو ہوتی ہی ہے۔ ہمارے شاستروں نے اسے رسوئی میں ماں۔ گھر میں بہن۔ بستر میں ویشیا اور باہر شوہر کی بہترین دوست مانا ہے۔

اس کا باپ بڑا شاندار آدمی تھا۔

اس نے کملا سے پہلے کی طرح لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا۔ ساری تنخواہ اس کے ہاتھ میں تھمانی شروع کر دی اور ارملا سے بھی باپ کی طرح پیار کرنا شروع کر دیا۔

وہ ماں باپ کی طرح ارملا کا ہر جنم دن بڑی دھوم دھام سے مناتے۔ دیوالیوں کا اور دوپتاؤں کا پیار پاکر ارملا جو بڑھنا اور پھیلنا شروع ہوئی تو ایک دم بیل کی طرح بڑھتی چلی گئی۔

بڑی ذہین لڑکی تھی۔ پڑھائی کی ہر منزل اس نے بڑی شان سے طے کی اور آخر کار ڈاکٹر بن گئی۔

برسلے سینٹرلی ہیڈ ڈفلیٹ میں وہ ایک ساتھ بستر میں لیٹے ہوئے تھے۔

زندگی کتنی عجیب ہے کملا۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں اب بھرپور سکھ دینا چاہتا ہوں۔ مگر تم تو جیسے سوکھ گئی ہو اندر سے۔

کملا نے پریم کو چمٹا لیا اپنے ساتھ۔ وہ اس کا پتی تھا۔ اس کا خداوند۔ مان مریادہ۔ سب کچھ۔

"تم دکھی کیوں ہوتے ہو۔ تم مہندر کی لڑکی گود میں لے لو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے اپنی کوکھ کی اولاد کی طرح پالوں گی۔ وہ تو اپنا ہی خون ہے۔"

میں جانتا ہوں کہ وقت بہت گذر چکا ہے۔ بائیس سالوں میں ہر طرح کی ناراضگی کے باوجود میں نے تمہیں کبھی دو تین دن سے زیادہ نہیں چھوڑا۔ اگر نتیجہ کبھی کچھ نہ نکلا۔

بابو جی نے کہا تھا کہ۔ مجھے تمہارا دل جیتنا ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں مگر پھر نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے، اور تمہارے زخموں کے ٹانکے پھر ٹوٹنے لگتے ہیں۔

اپنی زندگی ہی کچھ ایسی رہی ہے۔ دیکھو نہ تم ایک معمولی کلرک تھے اور اب برسیلز میں ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سکریٹری ہو۔ ہمارے پاس اب سب کچھ ہے۔ کار ہے، گہنے کپڑے ہیں نقد سرمایہ ہے۔ کہاں تم میرا گھر سے باہر جھانکنا بھی برداشت نہ کرسکتے تھے اور کہاں اب مجھے اس نئی آزاد فضا میں تتلی بنا کر گھماتے پھرتے ہو۔

کوئی وقت تھا کہ ہم دونوں اتنے صوفی تھے کہ پیاز تک سے پرہیز کرتے تھے۔ کہاں آج سگریٹ اور شراب ہمارا معمول بن گیا ہے۔ تم اپنے نجی بچے کے لالسا چھوڑ دو تو ہم جیسا سُکھی اور مطمئن جوڑا دنیا میں مشکل سے ملے گا۔" تم جانتی ہو کملا باوجی نے ایک بار کہا تھا، بچہ عورت کے پیٹ میں نہیں، اس کی روح میں ہوتا ہے۔" میں بائیس سالوں سے تمہارا پیٹ کریدے جا رہا ہوں مگر اس بیچ تمہاری آتما میں ایک بار بھی جھانک کر میں نے نہیں دیکھا۔ اب میں تمہاری آتما میں کچھ جگہ پالینا چاہتا ہوں مگر تم نے تو جیسے کواڑ بند کر رکھے ہیں۔

کملا رو رہی تھی۔ پریم بھی رو رہا تھا۔ اس رونے میں کتنا سکون ہوتا۔ جی ہلکا ہو جاتا تو وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتے۔

جانتی ہو جس روز مجھے کول صاحب نے بلا کر پوچھا تھا۔

"پریم تم یورپ جانا پسند کرو گے۔ میں برسلز کی اپنی ایجنسی میں منسٹری کی برانچ کھولنا چاہتا ہوں۔ چاہو تو میں تمہیں وہاں ایلچی بنا کر بھیج سکتا ہوں۔" خبر سن کر کچھ ایسی عجیب وغریب گدگدی ہوئی تھی مجھے کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی تھی۔ منسٹری میں ہر کوئی مجھے رشک وحسد سے دیکھتا تھا ان دنوں مگر میرے اپنے دل کے کسی گوشہ میں یہ بات رہ رہ کر کھٹکتی تھی کہ میری سیلیکشن کی وجہ میری نجی قابلیت نہ تھی تم تھیں اور قدرت کا ڈیزائن جو ہمیں ارملا کے پاس لئے جا رہا تھا۔ میں نے دل کو لاکھ سمجھایا کہ ارملا لندن میں ہے اور ہم برسلز میں ہوں گے۔ مگر دل نے کب مانی ہے عقل کی پاسبانی اور پھر میرا دل۔

تم بہت خوش تھیں۔ تم ارملا سے ملو گی۔ روز نہیں تو مہینہ دو مہینہ میں کبھی دن دو دن کے لیے ہی سہی۔ تم ارملا کی بات کرتیں تو میں جل جاتا یہ لڑکی آسیب ہے۔ کسی پچھلے جنم کی تم سے بچھڑی ہوئی کوئی آتما۔ تم تو ماں بن گئی تھیں مگر میں باپ نہیں بنا تھا۔

"یہ ارملا تمہیں بھابی کیوں کہتی ہے؟"

"تمہیں جو بھائی صاحب کہتی ہے۔ تمہارے ناتے بھابی ہی تو ہوئی میں اس کی۔ ہماری عمروں میں سولہ سال ہی کا تو فرق ہے مجھے امی کہے تو کیسا عجیب لگے"۔

"سو تو ہے"۔

"یہ ارملا اتنی شراب کیوں پیتی ہے"
"یہ ارملا اتنے سگریٹ کیوں پیتی ہے"۔
"یہ ارملا عورت ہے کہ مشین۔ کبھی تھکتی ہی نہیں۔ جب دیکھو کام۔ کام۔ کام۔ گویا سارے لندن کے بیمار اس کے بغیر مر ہی تو جائیں گے"۔
"یہ ارملا شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ ۵۰ سال کی ہونے کو آئی ہے۔ آخر کب شادی کرے گی"۔
کس سے کرے شادی۔
کسی سے بھی کرے۔
کوئی بھیڑ بکری تو نہیں۔
سارے لندن میں ایک بھی معقول آدمی نہیں ہے کیا۔
تم شادی کر لو ارملا۔ کس سے کروں بھابی۔
رکشت سے کر لو۔ تم پر جان چھڑکتا ہے
جان تو مجھ پر خان بھی چھڑکتا ہے اور مدھوسودن بھی اور رجالی چارلی۔ مگر شادی کیا ان سب سے کر لوں۔
تمہاری اپنی پسند؟
میری پسند تو ایک ہی ہے
کون؟
ایک عورت
تو تم لیسبین بنو گی۔ کون ہے وہ کمبخت عورت
کمبخت نہ کہو اسے۔ وہ تو میری جان ہے۔
مجھ سے کیوں نہیں ملوایا۔
روز ہی تو ملتی ہیں اسے آپ۔
بڑی بدمعاش ہو۔ مجھ سے اب کیا تم آدمی کا کام لو گی۔
میں تم سے سارے کام لے سکتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں بھابی جب تم میرے ساتھ لیٹ کر سو جاتی ہو۔ پیار سے میرے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیوں سے کنگھی کرتی ہو تو میری ارومانی نیچر کی ساری ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ یقین مانو بھابی میں نے جب بھی مرد کی ضرورت محسوس کی ہے مجھے بھائی صاحب یاد آ جاتے ہیں اور ان کا تم سے وہ سلوک۔

اب تو ہم بڑے خوش ہیں۔

اب تم اکتالیس کی ہونے آئی ہو۔ جب میں چالیس کی ہو جاؤں گی تو شادی کر لوں گی۔ کسی سے بھی، چالیس کو پہنچتے پہنچتے سکھ دکھ کا معیار ہی کیا رہ جاتا ہے۔

شکر ہے اب مجھے کبھی بچہ نہ ہوگا۔

کیا مطلب ؟

میں ہر مہینہ کی اس تکلیف سے چھوٹ گئی ہوں۔

کب سے ؟

چھ مہینہ ہونے کو آئے۔

کیا کہا۔ ابھی چلو میرے ساتھ ہسپتال۔ میں تمہارا معائنہ کرواؤں گی۔

تم خود ڈاکٹر نہیں ہو کیا ؟

ہوں ؛ مگر آپ کے لیے نہیں۔

ڈاکٹر ایملی جارج جب ایک گھنٹہ کے معائنہ کے بعد اپریشن تھیٹر سے باہر نکلی تو مسکرا رہی تھی۔

پریم ناتھ کو دیکھ کر بولی۔ مٹھائی کھلایئے۔

اور پھر ارملا کی طرف دیکھ کر بولی۔ تم بھی مٹھائی کھلاؤ۔ تمہاری بھابی کو تمہارا بدل مل گیا۔

"مسٹر پریم ناتھ آپ بڑے عجیب آدمی ہیں۔ آپ کی بیوی کو ساتواں مہینہ ہے اور آپ کو خبر تک نہیں۔ بچہ کمزور ہے مگر ٹھیک ہے۔ بڑی حفاظت کرنی ہوگی۔ آپ بیڈ کا خرچ برداشت کر سکیں تو میرا مشورہ ہے کہ مسز پریم ناتھ کو یہیں رہنے دیں۔"

پریم برسلز لوٹ گیا۔ کوئی ڈر والی بات نہ تھی۔

لندن میں ارملا جو تھی۔

اپنے مرحوم والد کی تصویر کے سامنے جھکا جھکا پریم بھبھک بھبھک کر رونے لگا۔ ڈیڈی مجھے تمہاری بہو نے معاف کر دیا۔ میں باپ بننے والا ہوں ڈیڈی دعا دو ڈیڈی کہ میری اولاد کملا ایسی لکشمی ہو میرے جیسی راکشش نہیں۔ مجھے بیٹا نہیں بیٹی چاہیئے ڈیڈی۔ کملا کی تصویر۔ میں کملا کا پیار پا گیا ہوں ڈیڈی۔ کملا نے مجھے اپنی آتما میں اپنے دل میں کچھ جگہ دے ہی دی آخر۔

پریم ناتھ کو لگا۔ وہ اب ایک اچھا آدمی بن گیا ہے۔

وہ واقعی اچھا آدمی بن گیا تھا۔

" آٹھویں مہینہ کا درد اچھا نہیں ہوتا مگر یہ ہو گیا ہے تمہاری بھابی کو جیسے اس میں زندہ رہنے یا بچہ کا بوجھ سہار لے جانے کی سکت ہی نہ رہی ہو میں سمجھتی تھی وہ خوشی سے پھولی نہ سمائے گی۔ مگر ہم نے اسے ایک بار بھی مسکراتے نہیں دیکھا پچھلے ایک مہینہ سے " ڈاکٹر جارج واقعی حیران تھی۔

بھابی آنکھیں کھولو۔ ڈاکٹر پوری تم سے ملنے آئے ہیں۔

بھابی نے آنکھیں کھولیں۔ اور رکشت کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

" آؤ جمائی بابو۔ خوش آمدید۔"

" جمائی بابو" ارملا خوش تھی کہ کملا نے بھی اس کی پسند پر اجازت کی مہر ثبت کر دی۔

رکشت نے شکرانہ کے طور پر کملا کے کمزور و لاغر ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

ارملا شادی کر رہی ہے۔ کملا نے پریم ناتھ کو بتایا۔

مجھے معلوم ہے۔ تاؤ جی کا خط آیا تھا۔ اس کی ممی اور سبھا اگلے مہینہ لندن پہنچ رہے ہیں۔

ارملا کی ممی۔

" ارملا کی ممی تو میں ہوں۔ ارملا کو میں نے پالا ہے۔ ارملا کی ممی میں ہوں۔ ارملا میری بیٹی ہے "

ہاں ہاں تم ہی ارملا کی ممی ہو مگر ایک دوسری عورت بھی ہے جس نے اسے جنم دیا تھا اس کا بھی تو کچھ حق ہے اور پھر وہ خود سے تھوڑے ہی آ رہی ہے۔ خود ارملا نے یہاں سے ٹکٹ بھجوائے ہیں ان لوگوں کے لیے۔

ارملا نے خود بلایا ہے سیتا کو؟

یہ کیسی جلن ہے۔

" ارملا کو اب میری ضرورت نہیں رہی "

" اس حالت میں تمہارا اس طرح ایجی ٹیٹڈ ہونا مناسب نہیں "

" یہ بچی تمہاری رہی۔ بھگوان کرے تمہاری ہی ہو کر رہے۔

سیتا اسے پالے پوسے گی، مگر بیٹی یہ تمہاری ہی رہے گی۔

" تم لکشمی ہو کملا رانی۔ آشیرباد دو اور رکھ دو اپنا مبارک ہاتھ میری پوتی کے سر پر "

" ماں تو تم ہو کملا رانی۔ میں تو تیری بیٹی کی آیا ہوں۔

جھوٹ ہے جھوٹ۔ آیا مجھ سے میری بیٹی چھیننے آ رہی ہے۔

" تمہارے تھنوں دودھ ہوگا کملا رانی۔ ایک چھوڑ دس بچے پلیں گے تمہارے تھنوں سے۔ بھگوان کرے تم دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو "

مجھے دس بچے نہیں چاہئیں۔ میری ایک ہی بچی ہے ہی ٹھیک ہے۔
یہ کیسا رشتہ ہے۔ تم تو ماں بن گئی ہو مگر میں باپ نہیں بنا۔
میں تمہارے بچے کی ماں کبھی نہیں بنوں گی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں۔
تم نے مجھ سے کبھی پیار نہیں کیا۔
میں اپنے پیٹ میں تمہاری نفرت کو سمیٹ کر نہیں رکھ سکتی میں انسان ہوں حیوان نہیں ہوں۔
تمہارے جسم میں بچہ جننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔
کون جانے نقص تم میں ہے یا مجھ میں۔
گالی دیتی ہے حرام زادی۔
جو آدمی مجھ سے پیار نہیں کرتا محض اپنے جسم کی بھوک مٹانے کی خاطر۔
وہ میرے بچے کا باپ بننے کا حق نہیں رکھتا۔
ظلم برداشت کرنا تو پاپ ہے نہ دادا۔
اب بولو میں کیا کروں۔ میں کیا کروں دادا۔ میں کیا کروں۔ ہائے میں کیا کروں۔
نرس نے آگر مارفیا کا انجکشن لگا دیا۔ آپ سو جائیے مسز پریم ناتھ اس حالت میں آپ کا یوں اس طرح پریشان رہنا اولاد اور ماں۔ دونوں کے لئے مضر ہے۔
اولاد!
میری اولاد!!
گردہ تو خوش و خرم ہے۔ ماں مر رہی ہے اور بیٹی بیاہ رچا رہی ہے۔ مگر میں نے خود ہی تو کہا کہ شادی کرلو رکشت سے کرلو وہ تم پر جان چھڑکتا ہے۔
میں بائیس سال سے تمہارا پیٹ کریدر ہا ہوں۔ تمہاری آتما میں ایک بار بھی جھانک کر میں نے نہیں دیکھا۔ اب میں تمہاری آتما میں کچھ جگہ پانا چاہتا ہوں۔ مگر تم نے تو میرے کواڑ بند کر رکھے ہیں۔
مگر وہ گھس آیا کسی طرح میرے من مندر میں۔
کیوں آنے دیا تم نے۔
ایک بیٹی کیا کم تھی تیرے لئے۔ لالچی کتیا۔
تمہاری بیوی اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے۔ ساری رات بڑبڑاتی رہتی ہے۔ دیکھتی ہوں تم نے اس غریب سے اپنی ازدواجی زندگی کے اولین مراحل میں مناسب سلوک نہیں کیا۔ ڈاکٹر جارج نے پریم ناتھ کو ٹوکا۔

"یہی زندگی کا راز ہے۔" مولانا نے سمجھایا۔
لو آگے بڑھو۔ اب تمہاری باری ہے۔
مگر اُس نے باری نہ لی تھی، جنگلے تک پہنچتے ہی لوٹ آیا تھا۔
باہر سڑک تھی، سنّاٹا تھا، نیند تھی۔
اندر کتنی ہمک تھی۔
مگر نیند نہیں تھی۔
اُسے میجر بمبا کی وہ تک بندی یاد آرہی تھی۔
باغ میں بولتی تھیں وہ بلّیاں۔
دو تھیں، یا تین
چار بھی ہوسکتی تھیں
یا پنج بھی
وقت تھا شام کا
آرام کا
اور کام کا
'کام'، ______
کام کہاں سوتا ہے۔
آدمی بیکار ہوتا ہے، نیند تبھی آتی ہے۔ کام میں نیند کہاں۔ اس بڑے صنعتی شہر کا سب سے بڑا اور اہم طبقہ ہم غریب مزدور لوگ ہیں، نیتا نے کہا تھا۔ تم جنتا ہو، تم ہندوستان کے ضمیر ہو۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا نیتا جی نے۔

ہم معمار ہیں، یہ محل، یہ فلک بوس عمارتیں، یہ سڑکیں یہ فٹ پاتھ، بجلی کے قمقمے کس نے لگائے بنائے ہیں۔"

آپ ٹھیک کہتی ہیں ڈاکٹر مگر اب میں اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں خدا کے لئے اسے بچا لیجئے۔

آخر وہ وقت بھی آپہنچا۔

تمہیں ماں اور بچے میں سے ایک کو چننا ہے۔

آپ میری کملا کو بچا لیجئے۔

زندگی میں پہلی بار پریم ناتھ نے باپ کی طرح ارملا کے سر پر ہاتھ رکھکر کہا۔ میں غلطی پر تھا۔ ہمارے لئے ایک ہی بیٹی کافی ہے۔

ارملا اور رکشت رو رہے تھے۔

یہ رشتے۔ ناتے کیسے کیسے رشتے گھڑ دیتا ہے تو ابلی جارج اپنے یسوع مسیح سے پوچھ رہی تھی۔

سیزیرین اپریشن ہوا۔ چار پاؤنڈ کا مردہ مسلا ہوا انسانی جسم۔

ہوش آنے پر کملا نے بستر پر ہاتھ پھیرا مگر بچہ قریب نہ پاکر چلانے لگی۔

بچہ بہت کمزور ہے اس قابل نہیں کہ اٹھا کر یہاں لایا جائے۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا تو تمہارے ہی پاس رہے گا۔

جب مریضہ نے بہت ضد کی تو ڈاکٹر جارج نے قریب کے کمرہ سے ایک ہندوستانی عورت کا نیا بچہ اسے ایک نظر دکھا دیا۔

دیکھا تم نے۔ تم کہتے تھے میں بچہ نہیں جن سکتی۔ تم مجھے پہلے ہی سے اسی طرح پیار کرتے تو آج تم دس بچوں کے باپ ہوتے۔

پریم ناتھ کی مسکراہٹ میں درد تھا۔ نم تھا مگر۔ بھگوان اب اور سزا مجھے نہ دینا میری کملا کو بچا لینا۔

اس رات جب سب چلے گئے اور کمرہ میں مریضہ کے علاوہ ارملا ہی رہ گئی تو عجیب اچنبا ہوا۔

ارملا نے دیکھا کہ بھابی نے اپنا دائیاں پستان چولی سے باہر نکال لیا ہے اور آنکھیں بند کئے کہے ہی بڑبڑا رہی ہے تم نے دودھ ہی تو نہ پیا تھا میرا۔ لو یہ بھی پی لو۔ دیکھو تو منوں دودھ امڈ رہا ہے میرے شریر سے۔ کام دھینو بن گئی ہوں۔

ارملا چپ چاپ کرسی سے اٹھی اور بھابی کے ساتھ لیٹ گئی۔ ماں کا دودھ اس نے منہ میں لے لیا اور بچے کی طرح بھابی کے تھن چوسنے لگی۔

کملا کے منہ پر وہی اچھا تھی جو ہر ماں کے منہ پر نوزائیدہ بچے کو پہلی بار دودھ پلاتے ہوئے آتی ہے۔

ساری رات ماں بیٹی اس طرح سوتی رہیں۔ پیار سے ماں کا ہاتھ بیٹی کے سر پر آشیرباد کی بام ملتا رہا۔ دودھ ختم ہوگیا۔

ارملا نہ روئی نہ چیخی چلائی چپکے سے اٹھ کر اس نے اپنی کملا بھابی کا منہ چادر سے ڈھک دیا۔

نوٹ :۔

میں نے اس کہانی کا کوئی عنوان نہیں رکھا کیونکہ اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے کہانی کا تناظر کچھ کچھ دھندلا سا گیا ہے اور اس کی واردات اس کے کرداروں کے یورپ منتقل ہو جانے کے بعد میری گرفت سے ماورا ہوگئی لگتی ہے۔

کملا اور ارملا دونوں زندہ ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ دونوں لیزبین ہیں۔ پردیم ناتھ بھی گرچہ زندہ ہے مگر ——————
مجھے یہ کہانی دوبارہ لکھنی پڑے گی۔

رام اور سیتا

یہ کلپنا کی دنیا بھی کیا دنیا ہے۔ ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا۔ ماسوا معصوم امید کے اور اپنی دھن میں آدمی گھنٹوں مست رہتا ہے۔ پیٹر وِڈول کا سنڈے کا لم اسے بے حد پسند تھا۔ پچھلے کچھ مہینوں سے پیٹر اس کے مستقبل کے بارے میں بڑی پیاری پیاری پیشین گوئیاں کر رہا تھا۔ اس کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ جلد ہی زندگی کا رنگ روپ کچھ اس ڈھنگ سے بدلے گا کہ وہ خود تو کیا ساری دنیا دنگ رہ جائے گی۔

سیتا اس کی بیوی عجیب چڑیا تھی۔ ان کی شادی دو سال قبل ہی ہوئی تھی مگر جہاں اکثر شادیاں ایک ہی سال میں بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ رام اور سیتا اپنے چھوٹے سے گھر کو جنت بنائے رکھتے تھے۔

رام نے کبھی اپنی اس چہکتی مہکتی چڑیا کو اداس یا مغموم نہ دیکھا تھا۔ جوانی کی اولین مہک سے تازہ و معطر اس انوکھے پرند کو جو بھی دیکھتا مسرور ہوتا۔ رام تو بیوی پر جان چھڑکتا تھا۔

ابھی وہ اکیس ہی برس کا تھا کہ ماں باپ سے بیک وقت ہاتھ دھو بیٹھا۔ خبر آئی تھی کہ اس کا بڑا بھائی جو رڑکی انجینئرنگ کالج میں پڑھتا تھا ایکا ایک بیمار پڑ گیا ہے۔ اماں اور باپو بیٹے کی تیمارداری کے لیے گئے تھے۔ موت کا بلاوا آتا ہے تو عجیب ڈھنگ سے اور کسی ایسی رشا سے جس کا آدمی کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ جس بس میں وہ دلی سے رڑکی کا سفر کر رہے تھے سہارنپور اور رڑکی کے درمیان دوسری سمت سے آتی ہوئی اپنے ہی ایسی، ایک دوسری بس سے ٹکرا گئی۔ دونوں بسیں سامان اور یاتریوں سے بھری ہوئی تھیں اور غیر ضروری رفتار سے بھاگ رہی تھیں۔ ٹکراؤ بڑا مہلک ثابت ہوا۔ بسیں تو برباد ہو ہی گئیں اکثر یاتری بھی اس تصادم سے

راہ ملک عدم ہو گئے، جو بچ گئے تھے وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ خود سے ہل جُل سکتے۔ مقامی پولیس اور بس کمپنی کے منتظمین نے زخمیوں کی معمولی مرہم پٹی کرنے کے بعد انھیں رڑکی کے سول ہسپتال میں پہنچا دیا۔ اسی ہسپتال میں رام کا بھائی بھی بیمار پڑا تھا۔ ماں باپ کے زخمی ہونے کی خبر اسے مل گئی تھی مگر وہ اس حالت میں نہ تھا کہ ان کے لیے کچھ کر سکتا۔ اس نے بس اتنا ہی کیا کہ اس حادثہ کی خبر رام کو نہ ملے کیوں کہ وہ ایم اے کا فائنل امتحان دے رہا تھا اور دو چار دن میں ہی اس کا امتحان ختم ہونے والا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنا آخری پرچہ دے کر گھر لوٹا اسے اس ناگہانی مصیبت کی خبر مل گئی۔ وہ پہلی ہی بس سے بھاگ کر رڑکی پہنچا مگر اس کی والدہ اور بڑا بھائی دم توڑ چکے تھے۔ کسی طرح روپیٹ کر اس نے ماں اور بھائی کا داہ سنسکار کیا اور پورے تن من سے زخمی باپ کی تیمارداری میں جٹ گیا۔

یہیں سیتا سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ سیتا کی ماں ابھی وہ بچی ہی تھی کہ مر گئی تھی وہ آج کل اپنی بوا کے پاس رڑکی میں رہتی تھی۔ مہینہ میں ایک آدھ بار اس کا باپ اسے آ کر دیکھ جاتا تھا۔ اس بار بھی وہ غریب اپنی بیٹی کو ہی دیکھنے آیا تھا کہ بس کے حادثے کا شکار ہو گیا۔

جس پیار اور ایثار سے یہ لڑکی اپنے دم توڑتے بوڑھے باپ کی دیکھ ریکھ کر رہی تھی وہ قابل دید تھا۔ رام کو جو حوصلہ اس بے ماں کی بچی کے بے پایاں ایثار و خلوص سے ملا وہ اسے اپنے دس رشتہ داروں کی چکنی چپڑی باتوں سے نہ ملا تھا۔

وہ جب بھی باپ کی تیمارداری میں مگن اس لڑکی کو دیکھتا۔ شردھا سے اس کا سر جھک جاتا اور من ہی من کہتا۔ "یہ لڑکی کسی بھی آدمی کے لیے خدا کا تحفہ ہو گی"

ایک ہی کمرے میں دونوں بوڑھوں کے بیڈ لگے تھے۔ رام، سیتا ہر ضرورت میں ایک دوسرے کا سہارا بنتے۔ پورے تین ہفتوں کے بعد بوڑھوں کو ہوش آیا۔ تقریباً ایک ساتھ دونوں نے آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹروں نے امید بندھائی کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں مگر یہ کیفیت دیرپا نہ رہی۔ ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ دونوں پھر بے ہوش ہو گئے اور ایسے کہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔

اسی ایک ہفتہ میں سیتا کی بوا کے مشورہ پر دونوں بزرگوں نے رام اور سیتا کی جوڑی کو اپنا اپنا آخری آشیرباد دے دیا تھا۔

اس گھٹنا کے تین مہینے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ اس بیچ رام کو اپنے مرحوم والد کے دفتر

میں خاصی معقول ملازمت بھی مل گئی تھی اور ان کا گورنمنٹ فلیٹ بھی اس کے نام الاٹ ہو گیا تھا۔

اس کا باپ ایک معمولی کلرک تھا مگر اس کی ماں نے اپنی گھریلو اقتصادیات کو خاصے سگھڑپن سے سنبھال رکھا تھا اور شوہر کی معمولی آمدنی کے باوجود گھر میں ہر وہ چیز جٹا رکھی تھی جس کی ضرورت کسی میاں بیوی کو ہو سکتی ہے۔

سیتا کے والد سرکاری ملازم نہ تھے۔ ایک فرم میں ہیڈ کلرک تھے۔ انہوں نے جو کچھ بھی چھوڑا تھا اس کی بوا نے بڑی ایمانداری اور نیک نیتی سے یکجا کر کے بیچ ڈالا تھا اور ساری رقم بھتیجی کے نام بنک میں جمع کرا دی تھی۔

ان کی شادی کو ابھی چھ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ نت نئے انکشافات رام کی زندگی میں زہر گھولنے لگے۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ زندگی پھول ہی پھول نہیں خاردار جھاڑ بھی ہے اور وہ سرتاپا قرض میں غرق ہے۔ اس کے ماں باپ نے اپنے بیٹوں کی تعلیم مکمل کرانے کی غرض سے جگہ جگہ قرض اٹھا رکھا تھا۔

اس کے بڑے بھائی کی انجینئرنگ کی تعلیم تو ظاہر ہے کہ مہنگی تھی ہی اس کی اپنی تعلیم پر بھی کچھ کم خرچ نہ آیا تھا۔

سیتا نے صورت حال سمجھ کر شوہر کو مشورہ دیا کہ ان دونوں کے پاس جو رقم ہے اور خود اس کے پاس جو زیور وغیرہ ہیں سب کو بیچ کر سارے قرض سے ایکدم سبکدوش ہو لیا جائے انھوں نے یہی کیا اور اپنی ضرورت کی چند اشیاء کے علاوہ گھر کی ہر وہ چیز بھی فروخت کر دی جس کے بغیر، روزمرہ ممکن تھا، جان ہے تو جہان ہے۔ سب پھر سے بن جائے گا۔ معمولی سے فرنیچر اور کچن کے چند برتنوں کے علاوہ اگر کسی ایسی چیز کو جو آسانی سے بک سکتی تھی سیتا نے بچا کر رکھا تھا تو وہ تھی اس کی سلائی مشین اور اون بُننے کا ایک ولایتی آلہ جو اس کی بوا نے اسے جہیز میں تحفہ کے طور پر دیا تھا۔

سارا بوجھ یوں ایک دم اتار کر وہ سُرخرو ہو گئے اور زندگی نئے سرے سے شروع ہو گئی۔

جہاں پیار ہو اعتماد ہو، یقین ہو، بھروسہ ہو وہاں سب اپنے آپ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

رام دفتر جاتا تو سیتا سوئیٹر بننے کی مشین لے کر بیٹھ جاتی۔ پڑوس کی ایک رحم دل بزرگ خاتون نے اس عجیب و غریب لڑکی کا حوصلہ دیکھ کر اس کی مدد کرنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ وہ اسے

باہر سے کام لا کر دیتی۔ چیزیں تیار ہو جاتیں تو واپس لوٹا بھی آتی۔ جتنے پیسے ملتے لا کر سیتا کے ہاتھ تھما دیتی۔ دھیرے دھیرے سیتا دس پندرہ روپیہ روز تک کا کام کرنے لگی۔ یہ رقم جٹ جٹا کر تقریباً اتنی ہو جاتی جتنی رام کی تنخواہ۔ یعنی گھر ایک کی بجائے دو تنخواہیں آنے لگیں۔

رام کو بیوی کی اس نئی مصروفیت کا قطعی کوئی علم نہ تھا۔ سیتا نے خود بھی یہ سب بتانا ضروری نہ سمجھا کیوں کہ اس کا خیال کہ یہ جان کر رام کی مردانہ حس کو اذیت پہنچے گی۔

گھر کا خرچ مزے سے چل رہا تھا۔ کسی قسم کی کوئی کمی نہ تھی۔ رام سمجھتا تھا کہ اس کی بیوی بڑی سگھڑ عورت ہے جو اس کی اتنی قلیل آمدنی میں ہی گھر سنبھالے ہوئے ہے۔

اسے اپنی بیوی سے والہانہ عشق تھا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی کہ جس سے معمولی قسم کا گھریلو لگاؤ ممکن نہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنی آمدن بڑھانے اور بیوی کے لیے نئی نئی خوشیاں بٹورنے کے منصوبے بناتا رہتا۔

اے کاش! اے کاش! ——— ممکن ہوتا تو چاند تارے توڑ کر بھی بیوی کے قدموں میں ڈال دیتا۔

شادی کے پورے ڈیڑھ سال بعد اس کی ترقی ہو گئی۔ چار سو ماہانہ سے ایک دم چھ سو ماہانہ۔ اس نئی خوش حالی سے سیتا کی مصروفیات میں البتہ کوئی کمی نہیں آئی۔ فیملی بجٹ میں اپنا حصہ وہ بدستور ڈالتی رہی۔

پچھلی سردیوں میں انھوں نے رام کے لیے ایک نئے اونی سوٹ اور سیتا کے لیے ایک بڑے اونی کوٹ کا منصوبہ بنایا تھا۔ مگر اپنی ساری تدبیروں کے باوجود وہ اتنی رقم جٹانہ پائے تھے کہ دونوں چیزیں ایک ساتھ خرید سکتے۔ ایک وقت میں سوٹ خریدنے کو رام تیار نہ تھا اور ایک وقت میں کوٹ خریدنے کو سیتا تیار نہ تھی۔

رام اب سینئر ریسرچ اسسٹنٹ تھا اور ایک اچھے معقول سوٹ کی واقعی اسے ضرورت تھی۔ صاحب لوگ اپنے ماتحتوں کو اچھے کپڑوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ سیتا کو بھی ایک معقول قسم کے زنانہ سوٹ کی ضرورت تھی کیوں کہ سردیوں کی شاموں میں وہ لوگ اکثر سینما یا ادھر ادھر گھومنے پھرنے نکل جایا کرتے تھے۔ رام کو تھیٹر سے بڑا لگاؤ تھا۔ جہاں کہیں بھی معقول قسم کی سوشل یا کلچرل ایکٹیوٹی ہوتی وہ سیتا کو لے کر پہنچ جاتا۔ سیتا کے بے پناہ حسن کو یوں اس طرح اپنے ساتھیوں میں پیریڈ کر کے اسے سکون ملتا تھا۔ وہ چاہتا تھا

کہ اس کے جاننے والے اس کی بیوی کو دیکھیں اور اس کی تقدیر پر رشک کریں۔

اسے یقین تھا کہ اچھے دن آنے والے ہیں۔ بیٹروڈول ہی نے نہیں دوسرے پرچوں اور رسالوں میں لکھنے والے جیوتشیوں نے بھی اس کے خوشگوار مستقبل کے متعلق پیشین گوئیاں کی تھیں۔

اگر مقدر اس کے لیے سیتا ایسی اپسرا چن سکتا ہے تو یقینی تھا کہ اس اپسرا کے یوگیہ ہونے کی صلاحیت بھی اسے ضرور عطا کرے گا۔ اس کا ایمان تھا کہ اچھی زندگی سیتا ایسی خوب صورت اور نیک سیرت بیوی کا حق تھا، "خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں"۔

جب تک وہ اپنی پیاری بیوی کے آرام و آرائش کے وہ تمام لوازمات جن کی وہ ہر لحاظ سے حقدار تھی، مہیا نہیں کر لیتا اسے چین نہیں آئے گا۔

اس کے ذہن میں جس زندگی کا تصور تھا وہ پیسے کی دنیا میں ہی ممکن تھی۔ دفتر میں اچھا کام تو وہ کرتا ہی تھا تاکہ وہ ترقی کر سکے اور سیتا کے یوگیہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ وہ ملک کے اخباروں اور سائنسی جریدوں کے لیے بھی لکھتا رہتا تھا تاکہ جو رقم بھی آئے وہ سیتا کی زیبائش پر خرچ ہو سکے۔ اچھے دن چونکہ قریب ہی تھے وہ قدرت کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے ہر صوبہ کی لاٹری ہر مہینہ خرید تا تھا۔ پندرہ بیس روپیہ مہینے کے اس خرچ کو ضروری سمجھتا تھا۔ مقدروں کے دیوتا اس پر مہربان ہیں اور اسے مالا مال کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر بے چارے دیوتاؤں کی بھی سیمائیں نہیں ہوتی ہیں۔ میں انھیں روپیہ دینے کا راستہ ہی نہ دوں گا تو وہ بے چارے دیں کے کیسے ــــــــــ

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اور سیتا سے بڑھیا جوڑی اڑوس پڑوس میں کوئی دوسری نہ تھی۔ خوش خلق، خوش مزاج، اور خوش لباس مرد اور عورت کی یہ جوڑی "ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں"، کا بڑا ہی عمدہ اشتہار تھی۔ لوگ کچھ کہیں مگر رام جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے جب تک وہ اپنی بیوی کے لیے کوئی ایسی بات نہیں کر دیتا جو شاہ جہاں نے اپنی ممتاز کے لیے کی تھی تب تک اسے سکون نہیں مل سکتا۔ شیشی میں بند پارے کی طرح بے قرار یہ جوان اڑ کر ستاروں کو چھو لینے کا دم خم رکھتا تھا۔ اسے اپنی ملازمت۔ زندگی میں اپنا نجی مقام، دو کمروں کا سرکاری کوارٹر، گھر کا فرنیچر، گھر کے پردے، اپنے پہننے کے پارجات ہر چیز معمولی بے حد معمولی دکھائی دیتی تھی جب کہ وہ غیر معمولی حقدار تھا۔ "میرے لیے نہ سہی مگر اسے خدا خود

اپنے ہاتھوں سے گھڑی ہوئی اس حسین مورت کے تحفظ و آرام کے لیے تو تمہیں کچھ کرنا ہی چاہیئے۔ یہ تیرا فرض ہے اور اس کا حق۔''

''تو نے مجھے اس عورت کا شوہر بننے کی عزت بخشی ہے تو اس کے لیے کچھ کر سکنے کی سکت بھی عنایت کر''

جین سنز کی دکان کے شوروم میں منگا ولایتی ٹوید کا وہ کوٹ۔ کیسے پھبا تھا سیتا کے جسم پر ——— ایسا لگا تھا مانو اس کی بیوی کے جسم کو پگھلا کر کوٹ کے اندر فٹ کر دیا گیا ہو۔

''محترمہ کو یہ کوٹ بہت بہت فٹ آیا ہے ینگ مین'' دوکان کے مالک نے کہا تھا۔ ''یہ ساڑھے چار سو روپے کی چیز ہے، میں تم سے چار سو ہی لے لوں گا، مگر یہ کوٹ انھیں ملنا ہی چاہیئے۔''

دکاندار کی بات اسے بے حد پسند آئی تھی۔ ''یہ شخص حسن کا سچا پارکھی ہے''، ''آپ بھی بڑے وہ ہیں''، سیتا نے جھوٹ موٹ ناراض ہوتے ہوئے کہا تھا ''وہ دکاندار ہے، سیلز مین بھی ہے ایسی باتیں یہ لوگ ہر کسی سے ہر روز کہتے ہیں۔''

مگر نہیں۔ وہ کوٹ سیتا کے لیے ہی بنا تھا ———

اکتوبر کی پہلی تاریخ تھی آج اسے تنخواہ کے علاوہ پورے چار سو روپے فالتو ملے تھے حال ہی میں اس کا پے اسکیل ریوائز ہوا تھا، یہ رقم اسی ری ویژن کا ایریر تھی۔ وہ بے حد مسرور تھا، پورے ایک ہزار کی رقم تھی اس کی جیب میں۔ دفتر سے خراماں خراماں چلتا ہوا وہ بس اسٹینڈ پر پہنچ گیا تو اسے خیال آیا ——— میونسپل کمیٹی نے سڑک کے آر پار کنکریٹ کا یہ پل ہم لوگوں کی حفاظت اور سہولت کے لیے بنایا ہے مگر ہم کبھی اس کا استعمال نہیں کرتے ہمیشہ بھاگ کر سڑک کراس کرتے ہیں۔ سوک سینس کی یہ کمی نہ جانے ہم ہندوستانیوں کے کردار سے کب جائے گی۔ کتنا خوب صورت پل ہے۔ وہ دن میں دو بار اسی راستہ سے آتا جاتا تھا مگر پل کی اہمیت جو اسے آج دکھائی دی تھی پہلے کبھی اس کا معمولی سا آبھاس بھی اسے نہ ہوا تھا اسے محسوس ہوا کہ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا ہے ——— خو[illegible] سہاونا موسم، نہ گرمی نہ سردی سال بھر ایسا ہی موسم رہے تو زندگی کتنی خوشگوار بن جائے اور ملک کہاں کا کہاں پہنچ جائے پھر کچھ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا دیا۔ کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی آب و ہوا اتنی دل کش سال بھر نہیں رہتی۔ انگلینڈ جو دھند میں لپٹا ایک حقیر جزیرہ ہے آدھی دنیا کا حکمراں رہ چکا ہے

اس نے سگریٹ سلگایا اور دھیمے دھیمے پل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گھر جانے کے لیے اسے سڑک کے دوسری طرف سے بس پکڑنا ہوتی تھی مگر آج کی طرح پہلے کبھی وہ پل پر نہ چڑھا تھا۔ پل کے اوپر پہنچ کر وہ رک گیا اور آتی جاتی ٹریفک کا نظارہ کرنے لگا۔ انسانوں اور گاڑیوں کی لہریں تھیں جو ایک کے بعد ایک پل کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔ لہر در لہر اسے آدمیوں کی یہ چہل پہل بڑی دل چسپ لگی ——— کتنے لوگ رہتے ہیں اس شہر میں اس نے سوچا۔ لوگ جو اس وقت آجا رہے تھے عموماً قرب و جوار کے سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کے ملازمین تھے۔ ہر کوئی جلدی میں تھا کوئی اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا تو کوئی اُدھر سے اِدھر آ رہا تھا۔ وہ آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں۔ کس طرف زیادہ لوگ جا رہے اور کس طرف نسبتاً کم یہ اندازہ کرنا محال تھا بسیں، کاریں، اسکوٹر، تانگے اور سائیکل۔ تانگے اس شہر میں کتنے کم ہو گئے ہیں۔ لپکتے بھاگتے اس دور میں تانگہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ چند سال بعد بمبئی کی طرح یہاں بھی سائیکل چلانا بند کر دیا جائے گا۔ پیدل چلتی ہوئی جنتا بھی اتنی ہی تھی جتنی بسوں اور دوسری سواریوں میں سوار تھی۔ انسانیت کا بے پناہ ہجوم۔ وقت کا ریلا، آدمی عورتیں اور بچے، ہنستے مسکراتے چہرے، مغموم و بدحال چہرے، سمٹی ہوئی روشنی اور ابھرتی ہوئی تاریکی کے اس جھٹپٹے وقفہ میں ہر کوئی گھر پہنچنے کی جلدی میں تھا۔ اکثر چہرے پہلی تاریخ کی روایتی جگمگاہٹ سے قدرے روشن تھے اور کچھ پہلی تاریخ کی روایتی جگمگاہٹ کے باوجود پریشان، امید، ناامیدی، دور اندران کے سینوں کے کسی گوشہ میں وہ ان منی جوت ٹمٹما رہی تھی جس کی حرارت سے زندگی حرکت اور تحریک لیتی ہے۔ وہ گنگنانے لگا ———

سردی ابھی دور تھی مگر فضا میں جو خنکی اس وقت تحلیل ہوئی جا رہی تھی وہ موسم سرما کی آمد کا اعلانیہ تھی۔ ستمبر کا سارا مہینہ بارش ہوتی رہی تھی، جس کی وجہ سے دلی کا موسم خاصہ خوش گوار رہا تھا۔ آج ہوا بند تھی مگر حبس نہ تھی خنکی تھی مگر سردی نہ تھی، بڑی عجیب کیفیت تھی آدمی خوش ہو تو ہر موسم اچھا، ناخوش ہو تو واہیات۔

اس نے اس وقت ایک سوتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ نکٹائی بھی جما رکھی تھی۔ اسے ٹھیک ڈھنگ سے کپڑے پہننا اچھا لگتا تھا۔ آدمی کی شناخت ان کپڑوں ہی سے تو ہوتی ہے۔

اچھے کپڑوں کا سوچتے سوچتے اسے جین سنز کے شوروم میں لٹک رہا وہ کوٹ یاد آگیا جو ولایتی ٹویڈ کے نرم و لطیف کپڑے سے بنا تھا اور جو سیتا کے بدن پر اتنی اچھی طرح فٹ

بیٹھا تھا ـــــ اب وہ دوسری طرف کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کوٹ کی یاد نے اچک کر اس کے پاؤں روک لیے اور وہ ٹھٹھک گیا۔

سیتا کی طبیعت آج صبح اچھی نہ تھی، مجھے جلد گھر پہنچنا چاہیئے۔ جیب میں اتنے روپے رکھ کر بس میں سفر کرنا خطرہ سے خالی نہ ہوگا۔ آج کے دن تو جیب کترے خاص طور پر تیار رہتے ہیں اسکوٹر پر بس کی نسبت دس گنا خرچ آئے گا، مگر مناسب یہی ہے کہ روپے لے کر صحیح سلامت گھر پہنچا جائے۔ سیتا اسے اور ان ڈھیر سے روپوں کو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ اسے لگا اس کی سوچ کے انداز میں کسی قدر کمینگی کی بو شامل ہو گئی تھی۔ پیسے سے سیتا خوش ہو جائے گی یہ سوچنا بھی ـــــ اسے اپنی حماقت پر غصہ آگیا اور سوچ کی دھار پھر جین سنز کے اسی کوٹ کی طرف لوٹ گئی۔ غنیمت ہے کہ سیتا اس وقت میرے ساتھ نہیں ہے۔ وہ ساتھ ہوتی ہے تو اپنے لیے کوئی غیر معمولی یا قیمتی چیز خریدنے نہیں دیتی۔ وہ اس کے لیے تو پوری تنخواہ خرچ کر دے گی مگر اپنے لیے کبھی کچھ نہ لے گی۔ وہ عورت بنی ہی کسی دوسری مٹی کی ہے۔

"میں کوئی باہر آنے جانے والی عورت تو ہوں نہیں ایک معمولی گھریلو عورت ہوں، میرے لیے اتنا قیمتی کوٹ کیوں خریدا جائے۔ میرے پاس رنجنوں سوئٹر اور شال ہیں۔ لمبا کوٹ لے بھی لوں گی تو رکھوں گی کہاں۔ الماری میں چھوٹے کوٹ پتلون مشکل سے آتے ہیں۔ باہر ٹنگا ٹنگا کوٹ خراب نہیں ہو جائے گا؟۔ نہ بابا نہ۔ مجھے نہیں چاہیئے یہ کوٹ۔ ہم کون پہاڑ پر رہتے ہیں۔"

وہ عورت بنی ہی کسی دوسری مٹی کی ہے۔

آج وہ ساتھ نہیں ہے اچھا ہی ہے۔ کوٹ تو ہم لوگوں نے دیکھ ہی رکھا ہے پسند ناپسند کا کوئی جھمیلا نہیں۔ آج جیب میں پیسے بھی ہیں۔ آج بھی وہ کوٹ نہ خریدا گیا تو پھر کبھی نہ خریدا جا سکے گا۔ کیا ہوا جو یہ کوٹ اتنا مہنگا ہے۔ سستا دو دن، مہنگا سو دن۔ کون ہم روز اس قسم کی چیزیں خریدتے ہیں۔

آج وہ اس قابل تھا کہ کوٹ کے دام چکا سکے۔ وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھا۔ پل کے پیسن پر آکر جیسے خود اپنے آپ کو مرعوب کرنے کی غرض سے وہ بلند آواز چلایا۔ "وہ کوٹ میری سیتا کے لیے بنا ہے۔"

ایکا ایک اپنی پیاری بیوی کے لیے کچھ کر سکنے کی بھاونا نے اس کے سارے وجود

"ہم نے" سب نے بلند آواز نعرہ لگایا تھا۔

"یہ سب ہمارا ہے" دوسرا نعرہ۔

"یہ شہر ہمارا ہے" تیسرا نعرہ۔

"سارے جہاں سے اچھا۔۔۔۔۔۔

"یہ عمارت البتہ سیٹھ گھنشیام داس جی کی ہے"

"اور یہ گلی بھی سیٹھ گھنشیام داس اسٹریٹ کہلاتی ہے"

سیٹھ گھنشیام داس کون سا خاندانی رئیس ہے۔ بمبئی میں ایک لوٹا لے کر آیا تھا۔ اپنی محنت اور مشقت سے اتنا بڑا آدمی بن گیا۔

یہ بمبئی ہے پیارے بمبئی۔ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر۔ یہاں آدمی کی قسمت ایک پان کے پتے کے نیچے دبی رہتی ہے۔ پتہ اڑا اور قسمت جاگی۔ چھوٹے قصبوں میں تو قسمت ایک بڑی وزنی سِل کے نیچے ہمیشہ ہی دبی رہتی ہے، سب قسمت کا کھیل ہے۔

پان کے پتے کی بات تم نے خوب کہی۔

اور لوٹے والی بھی۔

لوٹ اور لنگوٹ ہماری تہذیب کے واحد نشان ہیں جانِ من۔

تقدیر والی بات ٹھیک ہے مگر تدبیر ہو تبھی تقدیر بنتی ہے۔

غلط، تقدیر ہو تبھی تدبیر بنتی ہے۔

جب تک تقدیر نہیں بنتی ایسے ہی چُپ چاپ پڑے رہو اور انتظار کرو۔ اپنی بنائی ہوئی ان بڑی بڑی عمارتوں کی دیواروں سے سٹ کر لیٹ جاؤ اور بن پڑے تو سو بھی جاؤ۔

فٹ پاتھوں پر بکھری پڑی مردہ لاشیں بھی خواب دیکھتی ہیں۔ کون جانے کب

میں انبساط کی لہر دوڑادی اور وہ اسی خوابیدہ کیفیت میں پل کے پلیٹ فارم کے دوسری طرف پہنچ کر بس پکڑنے کی غرض سے دھیرے دھیرے چلنے لگا۔

ارے یہ کیا ؟

اس نے آس پاس دیکھا۔ پل پر دوسرا کوئی نہ تھا۔ ایک بار پھر اچٹتی ہوئی نگاہ دوڑا کر اس نے پھر پل کے فرش پر نظر لگائی۔

یہ کوئی وہم، سراب یا نظر کا دھوکہ نہ تھا۔ حقیقت تھی۔ پل کے بیچوں بیچ چپ چاپ پڑے پڑے وہ مسکرا رہا تھا۔

کرنسی نوٹوں کا پلندہ

اس نے اپنے پاؤں سے نوٹوں کے اس پلندہ کو ڈھک دیا اور پھر آخری بار ادھر ادھر دیکھ کر سارے نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیے۔

روپیہ کتنی اطمینان بخش حقیقت ہے۔ روپوں کو جیب میں رکھتے ہوئے اسے جو مسرت ہوئی اس کا تقرل اس نے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اس قسم کا یہ پہلا موقع تھا۔ نوٹوں کے گننے کی ضرورت نہ تھی۔ کون سی یہ اس کی اپنی کمائی تھی۔ نوٹ سب کے سب نئے تھے۔ کچھ دس دس کے، کچھ سو سو کے۔ سات آٹھ سو سے کم تو کیا ہوں گے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔

مگر یہ ہیں کس کے۔ کس نے پھینکے۔ جس بیچارے کے یہ نوٹ ہیں وہ تو آج شاید کھانا بھی نہ کھا سکے گا۔ اس نے پہلے یہ پلندہ کیوں نہ دیکھا تھا۔ اس پل سے چند منٹ قبل گذرنے والا وہ واحد آدمی تھا۔ اس نے کسی دوسرے کو پل پر چڑھتے یا اترتے نہ دیکھا تھا۔ تب پھر.....

کوئی ایسا آدمی جو اسی کی طرح آج صبح یا دوپہر پل سے گزرا تھا۔ مگر وہ تھا کون۔ یقیناً کوئی حاتم تھا وہ۔ یا پھر میری ہی طرح۔ بیچارہ

"میں نے یہ نوٹ پہلے کیوں نہ دیکھے" میاں تم ایسے ہی ہو۔ دن رات خوابوں کے تانے بانے بنتے رہتے ہو۔ تم نے پہلے بھی نظر ادھر کی ہوتی تو یہ مل جاتے۔

یہ تمہارے ہی ہیں جبھی تو تمہارے لیے سارا دن یوں اسی طرح پڑے رہے ہیں، کوئی دھات کی چیز تو ہے نہیں۔ کاغذوں کا پلندہ ہے، ذرا سی ہوا سے بھی اڑ سکتا تھا۔ تمہاری ہی

تقدیر رکھتی جبھی آج گھنٹوں سے ہوا میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔

کوٹ خریدنے کا اس کا ارادہ جو شاید سوچ کی کسی نئی لہر میں پھر ڈگمگا جاتا، اب قطعی پکا ہو گیا تھا۔ یہ روپے خدا نے بھیجے ہیں۔ میری سیتا کے لیے۔

یہ دیوتاؤں کا تحفہ ہے۔

دیوتاؤں کو محبت کرنے والے لوگ اچھے لگتے ہیں

سیتا خوشی سے جھوم جائے گی

آسمان سے برسی خدا کی اس رحمت پر میرا کوئی حق، ادھیکار نہیں۔

پیٹر نے پیشین گوئی کی تھی کہ جلد ہی کسی انجانی رشا سے اسے کچھ روپوں کا تحفہ ملنے والا ہے جو اس کی گھریلو زندگی کو جگمگا دے گا۔ پیٹر بڑی باکمال شے ہے۔

پل کو عبور کر کے وہ پہلی والی پٹری پر لوٹ آیا۔ کچھ دیر یوں ہی ان منے انداز میں کھڑا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی دھن گونج رہی تھی۔

سیتا کے لیے وہ کوٹ ——

ٹیکسی والے کو جین سنز کناٹ پلیس کا پتہ دے کر وہ اطمینان سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر نئے کوٹ میں ملبوس سیتا کو دیکھنے لگا۔ اسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ خدا بڑا کارساز ہے۔ بڑا رحیم، بڑا ——

ٹیکسی رکی۔ بل چار روپے بیس پیسے کا تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو پانچ کا نوٹ تھما دیا اور اس کے شکریہ کا انتظار کیے بغیر کناٹ پلیس کے کاری ڈار کی جانب لپکا۔

کوٹ دکان کے شو ونڈو میں پلاسٹک کی مغربی حسینہ کے بدن پر پہلے ہی کی طرح جمار کھا تھا۔

شام کے آٹھ بجے کا وقت ہو گا جب وہ کوٹ لے کر گھر پہنچا۔ سیتا گھر کی بالکنی میں کھڑی پچھلے دو گھنٹوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ گھر ہمیشہ وقت پر آتا تھا۔ آج ہی جانے کیا بات ہو گئی!۔

ایک بار اسی طرح دیر سے گھر لوٹنے پر اس نے کہا تھا۔ "اتنی دیر سے نہ آیا کرو جی"۔ ڈر لگتا ہے۔

ڈر کس بات کا؟

یہ دلی ہے۔ جہاں ہر روز ہر قسم کے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔"

تمہیں کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ کبھی کچھ ہوا تو مجھے ہی ہو گا۔

سیتا جی ہو نا۔

اس نے بڑے ابھیمان سے جواب دیا تھا۔ "اس میں کیا شک ہے"

سیتا کی یہ ادا اسے اکثر یاد آیا کرتی کتنی ہی بار وہ بھیانک حادثوں سے بال بال بچ گیا تھا۔

اس روز چنتا کی کوئی ہلکی سی شیڈ اگر کہیں سیتا کے چہرے پر آ گئی تھی تو شوہر کو دیکھتے ہی کافور ہو گئی

تم اتنی دیر کہاں تھے؟

جواب میں اس نے کوٹ کا پیکٹ سیتا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ہائے کتنا پیارا ہے۔ یہ وہی ہے نا!"

تمہیں پسند ہے؟

تم لائے ہو پسند کیوں نہ ہو گا۔

وٹ آر دی ڈیمیجز

نن

ڈونٹ ٹیل می۔ یو ڈڈ ناٹ فائنڈ اٹ آن دی روڈ؟

یس آڈڈ!

کچھ ایسی ہی بات ہو گئی آج۔ اس نے ساری کہانی سیتا کو سنا دی

بیچارہ!

کون؟

جس کے روپوں سے تم میرے لیے اتنا قیمتی تحفہ لائے ہو۔ جانے وہ کیا اور کیسا ہو گا اور جانے ——————

وہ کوئی —— آدمی نہ تھا سیتے۔ یہ کسی آدمی کا نہیں، دیوتاؤں کا ورادان ہے۔

کتنی ہی دیر تک نئے کوٹ میں ملبوس وہ شوہر کی گود میں بیٹھی اس کی نکٹائی رہی اور وہ اسے چومتا چاٹتا رہا۔ دونوں بے حد خوش تھے۔

تمہارے ہونٹوں کی چاٹ سے دل و دماغ تو کسی قدر بھر گئے ہیں مگر پیٹ خالی ہے اب ذرا کھانا بھی ہو جائے۔ اس بیچ میں ذرا نہا بھی لوں گا۔

وہ غسل خانے میں تھا جب اس نے مسز شرما کی آواز سنی۔

یہ لو اپنے روپے اور یہ لو چار کلو روئی اور نئے سوئٹروں کا ناپ۔ گن لو کل چار سو ساٹھ ہیں۔ دکاندار کو تمہارا ہاتھ بہت اچھا لگتا ہے، کتنی ہی عورتیں سوئٹر بنتی ہیں اس کے لیے مگر کہہ رہا تھا کہ دوسری کسی کے ہاتھ میں اتنی صفائی نہیں۔

غسل خانے کے دروازے کی اوٹ سے وہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سیتا مسز شرما کو اس کی موجودگی سے آگاہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے، مگر بڑھیا اس کا اشارہ سمجھے بغیر اپنی ہی دھن میں کہے جا رہی ہے۔

سچ کہتی ہوں سیتا بیٹی۔ تو لکشمی اور سرسوتی دونوں کی بیٹی ہے۔ لبھو رام کے نالائق بیٹے پچھلے دو سال سے چوتھی تک کسی طرح پہنچ کر کچھ ایسے اٹک گئے تھے گویا چوتھی جماعت ان کی پڑھائی کی آخری حد ہو اور اب پاس ہوئے ہیں تو اتنے اچھے نمبر لے کر ——————

لبھو رام اور اس کی بیوی تمہارے ٹیوشن کے پیسے اور مٹھائی لے کر ایک دو دن میں خود حاضر ہوں گے۔

تو سیتا گھر بیٹھے بیٹھے لوگوں کے بچوں کو پڑھاتی ہے اور دوسروں کے سوئٹر بھی بنتی ہے اب اس کی سمجھ میں آیا کہ گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے۔ میں بھی کہوں آخر ایسا کون سا جادو جاتی ہے سیتا جو میری تنخواہ کے اتنے کم روپوں میں اتنے شاندار ڈھنگ سے گرہستی چلا رہی ہے۔

مسز شرما لوٹ گئیں تو وہ غسل خانے سے باہر نکلا۔ سیتا نے اسے آتے دیکھا مگر منہ موڑ کر رسوئی میں مشغول ہو گئی۔ جیسے اس نئے انکشاف نے اس کی چوری شوہر پر ظاہر کر دی ہو۔

کپڑے بدل کر وہ کھانے کے لیے رسوئی میں ہی آ بیٹھا۔

چھ سو روپوں میں میری ٹرانسپورٹ بھی شامل ہے اور میرے سگریٹ، کافی اور دوسرے نجی قسم کے اخراجات بھی۔ بمشکل چار سو گھر کے خرچ کے لیے بچتے ہوں گے مگر پھر بھی ہم دیسی گھی کا بنا کھانا کھاتے ہیں

سیتا چپ تھی۔ ایسے بیٹھی تھی جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہو۔

نوالہ اس کے منہ میں تھا اور پانی اس کی آنکھوں میں۔ میں نے سوچا تمہیں میرا کام کرنا اچھا نہیں لگے گا مگر گھر بیٹھے بیٹھے مکھیاں مارتے رہنا بھی تو مناسب نہیں۔ دن کا خالی وقت کھانے کو آتا ہے۔ پھر میں خود تو کام لینے باہر جاتی نہیں، نہ پڑھانے ہی کسی دوسرے کے گھر جاتی ہوں۔ تین گھنٹے بچوں کو پڑھا لیتی ہوں اور تین گھنٹے سوئٹر وغیرہ بن لیتی ہوں۔ چھ گھنٹے کے کام سے کوئی مر تھوڑے ہی جاتا ہے

ہمارے دفتروں میں چھ گھنٹے جم کر کام کرنے والا ایک بھی آدمی نہیں۔ غالباً ملک بھر میں بھی نہیں، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے خود بھی دن بھر میں پورے چھ گھنٹے کام کبھی نہیں کیا۔

میرے کام میں دماغ تھوڑے ہی لگتا ہے۔

میرے کام میں ایسا کون سا دماغ خرچ ہوتا ہے۔

تم ناراض ہو؟

نہیں کسی قدر شرمندہ البتہ میں ضرور ہوں کہ یہ اوپر کا کام تمہیں میری وجہ سے کرنا پڑتا ہے۔ میرے گنے چنے روپوں میں تو شاید ہم دو وقت کا کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھا سکتے۔

دیکھو جی میں تمہاری ارد ھانگنی ہوں۔ تمہارا نصف! میرا بٹر باف

وہ صبح اٹھا تو دیکھا کہ سیتا ہاتھ میں چائے کا پیالہ لیے مسکرا رہی ہے۔

بڑے بدمعاش ہو۔ ساری تنخواہ میرے کوٹ پر لٹا دی اور مجھے دلاسہ دینے کے لیے ایک فرضی کہانی بنا کر سنا دی۔

کیا بکتی ہو!

بناوٹی غصہ جتاتے ہوئے سیتا بولی۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ کہاں ہیں وہ

روپے جو تمہیں پل پر پڑے ملے تھے۔

کیا کہہ رہی ہو جان میری۔ سب کچھ میرے کوٹ میں تو ہے۔

وہ تو یہ ہے۔ تمہارے دفتر کے خزانچی کی بنائی ہوئی تمہاری تنخواہ اور ایریرز کی تفصیل!
تنخواہ ۶۵۰ روپے + ایریرز ۴۰۰ روپے۔ اور یہ رہا کوٹ کا کیش میمو۔ اندر کی جیب پھٹی ہوئی تھی تو مجھے کیوں نہ بتایا۔ ہمیشہ اسی باہر کی جیب میں پیسے رکھتے ہو کیا؟

وہ ایک دم جیسے سکتے میں آ گیا۔ اس کی زبان گنگ۔ پچھلے دن کی ساری واردات اس کے ذہن میں چکر لگانے لگیں۔ چائے کے پیالہ کو لاشعوری طور پر پکڑے پکڑے وہ گزرے کل کی یادوں کو کتنی ہی دیر ذہن کے ناخنوں سے کریدتا رہا ــــ پھر یکلخت عجیب و غریب آوازوں میں قہقہے اس کے شعور کے چشموں سے جھرنوں کی طرح پھوٹ پڑے ــــ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور پیالی کی چائے چھلچھلا کر بستر پر بکھر گئی ــــ کیسا مذاق کیا تھا قدرت نے ــــ

بے بسی کا قہقہہ آدمی کے قد کو کس بیدردی سے بونا دیتا ہے۔

ظاہر تھا کہ جو روپے اس نے پل پر پڑے پائے تھے اس کے اپنے ہی روپے تھے۔
جنہیں اس نے پل پر سے پہلی بار گزرتے ہوئے کسی طرح غالباً رومال نکالتے ہوئے گرا دیا تھا وہ خوش نصیب تھا کہ روپے اسے واپس مل گئے اور ایک اچھے کام لگے۔ اس نے کوٹ کے بارے میں اتنی شدت سے نہ سوچا ہوتا تو وہ پل کو دوسری بار کراس نہ کرتا۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو، وہ ایک دم کسی انجانے خوف سے لرز گیا۔

کافی دیر گنگ رہنے کے بعد اس نے سیتا کو پیار سے اپنے ساتھ لٹا لیا۔

ہٹو بھی۔ رات بھر سوئے نہیں ہو۔

تم جانتی ہو سیتا۔ تمہارا یہ کوٹ حاصل کرنا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا میں سوچتا ہوں خدا بھی میرے اس عزیب سے جذبہ کو بھانپ گیا تھا۔ کس انوکھی اور معصومانہ عیاری سے مجھے اس کو خریدنے کا مشورہ دیا یوں نہ ہوتا تو شاید چار سو روپے کے اس ایریر کے باوجود میں تمہارے لیے یہ کوٹ ابھی نہ خریدتا

میں خوش ہوں کہ ایسا ہوا۔ کل شام میں نے تمہیں اس کوٹ میں دیکھا تھا۔

یہ کس انوکھی پھبن سے تمہارے بدن پر کھلا تھا۔

یہ تمہارے ہی لیے بنا تھا۔

سیتا کی آنکھیں بھر آئیں۔ خوشی کے یہ آنسو کتنے بھلے ہوتے ہیں۔

دونوں خاصی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے میں سمٹے روتے روتے ایک بار پھر سو گئے۔

بلراج ورما کا جنم ۱۰ جنوری ۱۹۲۳ء کو ضلع ہوشیار پور میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم راولپنڈی میں اپنے ننھیال میں پائی۔ بی۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ پینتیس برس حکومتِ ہند کی ملازمت کے بعد انڈر سکریٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ پھر دو برس مرکزی سنگیت ناٹک اکاڈمی کے سہ ماہی انگریزی جریدہ "سنگیت ناٹک" کے مُدیر رہے۔ اِن دِنوں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے سینیئر فیلو کی حیثیت سے انگریزی میں آزادی کے بعد اُردو ادب کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اُردو کی رسمی تعلیم نہ ہونے کے باوجود اُردو ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ پہلا افسانہ مشہور زمانہ رسالہ "ساقی" میں ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں ایک معیاری ادبی صحیفہ تناظر کا اجرا کیا۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "ایوژن" کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

ناشر

کوئی خواب دہ خبر دے جائے جس کا انھیں انتظار ہے۔

خواب عمارت کے اندر والوں کا ہی نہیں ہمارا بھی حق ہے۔

یہ حق تمہارا ہی ہے پیارے۔ اُن بیچاروں کے پاس خوابوں کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔

اتحادی زندہ باد۔

ہٹلر مُردہ باد۔

اتحادی جیتے اور ہندوستان آزاد ہوا۔ سر سکندر حیات خاں کا اعلان پھر کیا۔ پھر آزادی۔ سب اپنا۔ یہ زمین، یہ آسمان، یہ محل، یہ کشادہ خوبصورت سڑکیں۔

بات زمین، آسمان اور فٹ پاتھ تک ہی محدود رہنے دو میرے عزیز۔

کہرے کی چادر میں ڈھکا ہوا یہ چتکبرا، داغدار شہر کبھی کبھی کتنا اچھا، کتنا سہانا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے یہ رنگ مخالف قوتیں ہیں۔ حیات کے منتشر اجزا جو ایک دوسرے پر حاوی ہو جانے کے لیے بے قرار ہیں۔ عارضی طور پر ہی سہی وہ آج اِن سب رنگوں کو باہم ملائے گا، جوڑے گا، ایسے کہ وہ ست رنگی کمان بن جائیں۔ اندر دھنش، کام دیو کی کمان جس کے سارے تیر وہ اپنے سینے پر جھیلے گا۔

جینے کی تمنّا ——— بلرام جی کا ہل۔

ہل چلانا سازش نہیں۔ زمین کو جوتنے کے لیے ہی ہل چلایا جاتا ہے، ہل چیرتا پھاڑتا ہے مگر ناکارہ بنجر زمین سے خس و خاشاک نکال کر دور پھینکنے کا دوسرا کوئی طریقہ بھی تو نہیں۔

ایکا ایک اس کے ذہن میں نیا نقشہ، ایک نیا خاکہ اُبھرنے لگا۔

باغِ عدن سے مش ایک باغیچہ جو بہاروں میں پھول اور خزاؤں میں پھل

دیتا ہے۔

زمین کو ایک بار پوری محنت اور مشقت سے ہل چلا کر نرم کر لو۔ پھر چھوڑ دو سال بھر کے لیے۔ نرمی میں دُو دھ سمتا ہے۔

سفید سیّال مادہ۔ میٹھے پانی کا اُبھرتا اُچھلتا دھارا۔ دریا کے دھارے کی طرح تیز مگر دبے پاؤں۔ خاموش، دریا کی سطح کی طرح۔

ابھی ابھی وہ اتنا خوش تھا اب پھر کیوں ٹوٹنے پھوٹنے لگا ہے۔

زندگی کے سارے دھاگے پھر سے اُلجھنے لگے ہیں۔ سب کچھ پھر سے بکھرنے لگا ہے۔

وہ اِن دھاگوں کو پھر سے ملائے گا جوڑے گا، باہم بٹھائے گا تاکہ یہ ایک دوسرے سے پھر وابستہ ہو جائیں ہم رنگ اور ہم آہنگ ہو جائیں۔ اور زندگی کا ننگا پن ڈھک جائے۔ اپنے جامۂ حیات کو وہ اب مزید پھٹنے نہ دے گا۔ تانے بانے ملانے کی ترکیب آجائے تہذیب خود بخود آجائے گی۔

وہ اپنے ان نئے تاثرات کو تہہ کر کے لپیٹ کر، جوڑ کر یکجا کرنے لگا۔

بغیر دُکھ اٹھائے سکھ نہیں ملتا، سُکھ کی قیمت دُکھ ہے۔

کُتّا بھی کسی گندی جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ اُس جگہ کو دُم سے صاف نہ کرلے۔

زندگی کتنی موہنی، کتنی دلدار کتنی خوش طبع صاف اور شفّاف ہے۔

یہ زیرِ لب گفتگو بھی کیسی بھلی لگتی ہے۔ بہتے پانی پر ناز و ادا سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی ناؤ۔

——— منظر ———

ٹرے کوٹ کے کالر اٹھائے اور ہونٹوں میں ایک بڑا امریکی سگار دبائے دھیرے دھیرے چلے جا رہے تھے اپنے ساتھی کے پیچھے پیچھے وہ بھی چُپ چاپ

سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔

بمبئی میں ٹریفک کنٹرول کتنا اچھا ہے۔

ایک سڑک آنے والی گاڑیوں کے لیے۔ ایک جانے والی گاڑیوں کے لیے۔ آر پار اور بیچوں بیچ فٹ پاتھ۔ کھلے کشادہ فٹ پاتھ۔ رات کو آرام کرنے اور سونے کے لیے کتنی کھلی ہوا دار جگہ دستیاب ہے۔ گوری تہذیب کی برکتیں۔

کہیں کوئی معصوم بچہ" ماں کی چھاتیوں پر اپنا ننھا مُنّا ابو دھ چہرہ رکھے سو رہا ہے۔ کہیں کوئی قریب المرگ بوڑھا اپنی بیمار تھکی ہوئی ہڈیاں سمیٹے گٹھڑی بنا اونگھ رہا ہے۔

جوان تو کبھی بھی، کہیں بھی سو سکتا ہے۔

مرد عورتیں اور بچے"، زندگی سے بے خبر بھی باخبر بھی مگر موت سے یقینی بے نیاز ——

دونوں سڑکوں کے بیچوں بیچ بچھے لمبے ٹاپو پر بجلی کے قمقموں کی دھیمی تھکی مدہوش روشنی ایک چھیلا نقل نگار کی بانکی البیلی نفاست سے انجانے اشاروں میں بے آواز پینٹو مائم دکھا رہی ہے۔

موت اور زندگی ایک دوسرے کے اتنے قریب۔

مگر زندگی بہر حال زندہ تھی۔

شانتی نے ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا " وہ دیکھو "

" کام واسنا کبھی نہیں مرتے۔"

عورت کا پیار چیتن مایا ہے، جو اپنی ظاہری مٹھاس سے آدمی کو چھلتی ہے، جسم ایک چھوٹی سی میلی کچیلی چادر میں اپنے آپ کو ڈھکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں ننگی تھیں ——

ایک کالی

دوسری سانولی

ایک پر بال تھے۔

اُسے دھکّا سا لگا۔ عاجز نگاہوں سے اُس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا، گویا کہہ رہا ہو۔ آج بس اتنا ہی کافی ہے۔ چلو لوٹ چلیں۔

ڈاکٹر جو فلسفی تھا اور سب کچھ جانتا تھا مسکرا دیا۔ بے دل حزیں مسکراہٹ جس کا منبع دل نہیں تھا، فلسفی کا ذہن تھا۔ منی پلانٹ کی طرح۔

کچھ اور آگے چل کر ڈاکٹر یکایک رُک گیا۔ اُس کے بوٹ کی ٹھوکر کھا کر ایک ادھ ننگا زنانہ جسم دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ لیٹنے کی حالت سے بیٹھنے کی حالت میں آنے کی نحیف کوشش جس میں کشمکش تھی، الجھن بھی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ آنکھیں ملتی ہوئی بالکل بیدار ہو گئی۔

ڈاکٹر کے ہونٹوں کا امریکی سگار اُس کے دانتوں کی جکڑ میں کچھ ایسے پھنس سا گیا تھا جیسے عقاب کی چونچ میں کوئی چھوٹا پرندہ۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس چمک میں اُجالا نہ تھا، ایک شعلہ تھا ایک ایسی لپکتی لَو جو اس اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔

بیدار ہو کر آدمی ہوشیار ہو جاتا ہے۔ کسی قدر نڈر بھی ہو جاتا ہے۔ عورت نے پہلے ڈاکٹر کا جوتا چھوا پھر اس کی پتلون کو پکڑا اور پھر باہ اندر لے جا کر وہ اُس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی، بالکل ایک بچّے کی طرح۔

ہر دُکھی جیو بکاؤ ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی سے روشنی بھگا دو پھر اسے کال کوٹھڑی میں بند کر دو ——— پھر اُسے نجات کی راہ دکھا دو۔

عورت نے رحم طلب نگاہوں سے اوپر دیکھا پھر اپنے گال ڈاکٹر کی ٹانگوں سے

شادیے ـــــــ اور بڑی پُر امید معصومیت سے اپنے نجات دہندہ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے وہ کسی ایسے ہی سانحہ کی انتظار میں تھی۔

انتظار بھی کام ہوتا ہے۔ ہر کوئی جو انتظار کرتا ہے جانتا ہے۔

چلوگی ؟

عورت نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

ذرا دور چلنا ہوگا، ڈاکٹر نے مزید کریدتے ہوئے کہا۔ چل سکوگی ؟

عورت نے پھر اسی طرح سر ہلا دیا۔

بھوکی ہو ؟

عورت نے چپ چاپ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا پھر جیسے بڑی مشکل سے سر ہلا کر کہا۔ 'ہاں'۔

اس لفظ 'ہاں' میں مجبوری تو تھی ہی، امید بھی تھی۔

عورت کے خشک ہونٹوں سے السائے ہوئے دھوئیں کی طرح یہ لفظ نکلا اور فضا میں تحلیل ہوگیا، ساری فضا بوجھل ہوگئی۔

"کیسی بوجھل فضا ہے"۔ شانتی سوچ رہا ہے۔

عورت وہ زبردست خطرہ ہے جس سے خبردار نہ رہا جائے تو آدمی ایسی دلدل میں پھنس جاتا ہے جس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ عورت نڈر ہو جائے تو اس میں ہمت اور بے پناہ استقلال آجاتا ہے اور وہ چنڈی بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر نے کوٹ کی جیب سے اخروٹ، بادام، سوکھی خرمانیاں، بھنا ہوا کاجو اور کشمش نکال کر عورت کی جھولی میں ڈال دیے۔

اُس نے یہ سب کب جیب میں رکھا تھا شانتی کو یاد نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد کاجو واجو کی بات کو غیر ضروری سمجھ کر وہ عورت کی طرف دیکھنے لگا جس کی آنکھیں

جُملہ حُقوق بہ حقِ مصنّف محفوظ

مُصنّف — بلراج ورما
سرِورق و تزئین — مُکتی ورما
کتابت — محمد صلاح الدین و محمد عمر
طباعت (آفسیٹ) — نودیپ آفسیٹ پرنٹرس - دہلی
بار اوّل — دسمبر ۱۹۸۳ء
قیمت — روپے

نَاشِر و تقسیم کار

تناظر پبلی کیشنز

۴۲ڈی - میور وہار - پاکٹ ۳ - دہلی ۱۱۰۰۹۲

ہمارے علاوہ آپ یہ کتاب مندرجہ ذیل اداروں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں :-

(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ - نئی دہلی - دہلی - علی گڑھ - بمبئی
(۲) انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راوز ایونیو - نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
(۳) سٹار پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، آصف علی روڈ نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
(۴) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
(۵) ساکار پبلشرز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، ۱۰۷ اجولی بھون، ۱۰ امیرسن لائن چرچ گیٹ، بمبئی - ۴۰۰۰۲۰
(۶) شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں اور اپنے محسن کو ایک ٹک گھورے جا رہی تھیں۔

ہر چیز کی ایک مقررہ قیمت ہوتی ہے۔ جسے چکا دینے کے بعد ہی آپ اُسے حاصل کر سکتے ہیں۔ قیمت کی ادائیگی آپ نقدی کی صورت میں کریں جنس کی روپ میں کریں یا کوئی اچھا کام کر کے۔

اندھیرے کی وجہ سے آنکھوں کی غیر معمولی چمک کے علاوہ عورت کے خدّ و خال واضح نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے ذرا رُک کر شانتی کی طرف دیکھا گویا پسند ناپسند کی بات پوچھ رہا ہو، مگر اپنے ناتجربہ کار ساتھی سے کوئی مناسب جواب نہ پا کر وہ صرف مُسکرا دیا۔

تو ٹھیک ہے چلے گا، اُس نے اپنے ساتھی کو پسند کے پکش میں سمجھتے ہوئے کہا۔ رات بھی تو بے حد کالی ہے، پھر لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا "تم اسے کھاتے کھاتے ہمارے پیچھے چلی آؤ۔ ہم تیز نہ چلیں گے، مگر ہمارا تمھارا فاصلہ معقول رہے گا، کیونکہ "ہم شریف لوگ ہیں"۔

شانتی حیران تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ مسکرانا ایکدم بھول گیا ہو اور اُس کی ساری چیتنا جیسے سو گئی ہو۔ ڈاکٹر نے اسے کاندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اپنے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر اس کے ہونٹوں میں ٹھکا دی اور لائٹر سے اُسے سلگاتے ہوئے ہوئے بولا "تم ہوش میں تو ہو"۔

شانتی جیسے نیند سے جاگ اُٹھا ہو اُس نے اکھڑے اکھڑے ڈھنگ سے اپنے راہبر کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "میں یہ سب کچھ نہیں سمجھتا۔ یہ سب اتنے جلدی کیسے ہو گیا یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا مگر تم اسے ٹھیک سمجھتے ہو تو شاید یہ ٹھیک ہی ہے۔

اور وہ لوٹ چلے۔ دُھواں چھوڑتے ہوئے وہ چُپ چاپ چل رہے تھے۔ بیچ بیچ میں شانتی پیچھے مڑ مڑ کر اندھیرے میں نپی تُلی دوری پر کسی قدر لڑکھڑا کر رینگتے ہوئے

اس سائے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

ہم نے اُسے دیکھا بھی نہیں۔

ضرورت نہیں تھی۔

مطلب ؟

بھوک میں مرغی کا بدن نہیں پرکھتے۔

مگر وہ تو ہمیں دیکھ سکتی ہے۔ ہم روشنی میں چل رہے ہیں اور وہ اندھیرے میں۔

وہ بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ وہ صرف ہمارا لباس دیکھ رہی ہے۔ ہمارے صاف ستھرے کپڑے جو ہمارے اچھے گاہک ہونے کے ضامن ہیں اور مقناطیس کی طرح اُسے ہماری جانب کھینچے لیے آرہے ہیں۔

اُسے یاد آیا۔ مُرشد نے کہا تھا۔ یہ جسم جس کی ہم اتنی آرائش و زیبائش کرے ہیں۔ ہماری روح کی قبر ہے۔ اپنی ناسمجھی میں قبروں کے ملاپ کو ہم پریم ملن کہتے ہیں۔ دنیوی خواہشات کو کم کرو۔ من کا مقابلہ، دلیری اور مستقل مزاجی سے ایک بہادر سپاہی کی طرح کرو۔

بہادر سپاہی

کہاں ہے وہ بہادر سپاہی جو عورت کی حقیقت کو جھٹلا سکے۔ ہم سب کائر ہیں۔

کچھ دیر پھر دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ اب ہوا بھی چلنا شروع ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ماحول کسی قدر خنک ہو چلا تھا۔ سمندر کی لہروں کو چھُو چھُو کر آتے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ کیا سوندھی سوندھی اور خوشگوار بو تھی فضا میں۔ شانتی نے محسوس کیا کہ وہ یکایک لمبے لمبے سانس لینے لگا ہے تاکہ اس کے خشک پھیپھڑے ہوا کی اس مہک سے بھر جائیں۔ پھر ایک عجیب قطعی انوکھے خیال کے ذہن میں ابھرتے ہی وہ مسکرا دیا۔

کیا وہ اپنے آپ کو کسی ایسے کام کے لیے تیار کر رہا تھا جس میں ان گنت سانسوں کے خرچ کا امکان تھا۔

"حیرت ہے" یکا یک اس کے منہ سے نکل گیا۔

"تم نے کچھ کہا" ڈاکٹر نے پوچھا۔

میں سوچ رہا تھا۔

"تم ضرورت سے زیادہ سوچتے ہو۔"

سوچنے کی بات ہی ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ تم نے اس لڑکی کو پہچانا کیسے؟۔

"وہ لڑکی ہے یا بھرپور عورت" ڈاکٹر نے اسے پھر اُلجھا دیا۔

اسے لگا ڈاکٹر شرارت پر اُتر آیا ہے اور جان بوجھ کر اس کی جوان اُمنگوں کے ریتیلے گھروندے مسمار کیے دے رہا ہے۔ اُسے ڈاکٹر کی یہ حرکت طفلانہ سی لگی۔ جیسے ریت سے کھیلتے ہوئے شریر بچے لات مار کر ایک دوسرے کے گھر توڑ دیتے ہیں۔

پھر کسی قدر سنبھل کر وہ بولا "میں سوچ رہا تھا کہ تم نے اسی کو ٹھوکر کیوں لگائی، وہاں ایسی کتنی ہی دوسری عورتیں بھی تو تھیں۔ کسی دوسری کو کیوں نہیں۔

"یوں سمجھ لو کہ مجھے ایسے جسموں کی پرکھ ہے جو غیروں کے پاؤں کی ٹھوکر کھا کر بگڑتے نہیں بلکہ ان سے لپٹ جاتے ہیں۔ ہر بھوکے کو بھوک مٹانے والی رکابی کی پہچان ہوتی ہے۔ بھوکا بھوکے کو پہچانتا ہے۔ سمجھ لو کہ ہم نے بھی ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

شانتی کی تسلی نہیں ہوئی۔ مگر ڈاکٹر چپ ہو گیا۔

شانتی نے دیکھا دھیرے دھیرے اُس کے راہبر کے چہرے کے ہاؤ بھاؤ بدلنے لگے ہیں۔ اُس کے ہونٹوں کی شریر مسکراہٹ بھی کافور ہوئی جا رہی ہے ——— اور پھر اُسے ایسا لگا جیسے ڈاکٹر کا بزرگ و باوقار چہرہ ہزاروں سینکڑوں ریکھاؤں سے بھر گیا ہے۔ اور اس کے ہونٹوں کی خوشگوار مسکان ایکدم غائب ہو گئی ہے۔

ظاہر تھا کہ ڈاکٹر کے اندر اس کے ضمیر اس کی آتما میں کوئی انجانی اتھل پتھل مچ رہی ہے۔ اور اس کے ذہن کی گہرائیوں میں کوئی زلزلہ سا آگیا ہے جو اس کا سب کچھ الٹ پلٹ رہا ہے، توڑ پھوڑ رہا ہے۔

شانتی ڈر گیا۔

وہ جانتا تھا کہ اس کا ساتھی بڑا با اصول آدمی ہے اور جن اصولوں کا وہ اکثر ذکر کیا کرتا ہے انھیں بہت حد تک وہ اپنی نجی زندگی میں ڈھال سکا ہے۔

اصولوں کا تذکرہ ایک چیز ہے، اصولوں کی پابندی قطعی دوسری چیز ہے۔ آج وہ اصول یکا یک کہاں چلے گئے۔

گورو کو آزمانا کفر ہوتا ہے۔

مرشد، مرشد ہے۔

عمل با ادب خواہ کم ہی ہو، زیادہ علم سے زیادہ بہتر ہے۔

فقط اصولوں کا علم ہونے سے کیا ہوتا ہے جب تک آدمی اُن کے مطابق اپنی راہیں متعین نہیں کرتا۔

بغیر عمل کے ہر عالم اس گدھے کی مانند ہے جس کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

خود زندہ مثال بن کر دکھانا اُصولوں کے اُپدیش سے بدرجہا بہتر ہے۔

اُس نے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ آج اُسے کیا ہو گیا ہے۔

شک، مرشد پر شک کفر ہے۔

مگر آج وہ دونوں، وہ اور اُس کا مرشد ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہونے جا رہے ہیں جس کا کفارہ ممکن نہیں ہو گا۔

"تم سمجھتے ہو وہ کوئی فاحشہ ہے، سستی بازاری رنڈی ہے، یکا یک مُرشد اُبل پڑا۔

"عورت کو پیٹ بھرنے کے لیے کوئی دوسرا مناسب کام نہیں ملتا جبھی وہ جسم کا سودا کرتی ہے۔ تم پیٹ کی خاطر اپنی کلا تک بیچ دیتے ہو اور تمھاری وہ نیلا نسبتاً اچھی اور محفوظ زندگی کے لیے تمھارا پیار چھوڑ کر ——— مگر یہ ابھاگی لڑکی ——— جھوٹا فریب خودنمائی اور خودستائی کی بدبوؤں سے بھری لدی تمھاری تہذیب جب اس غریب کو کوئی معقول کام نہیں دیتی۔ گھر نہیں دیتی، شوہر نہیں دیتی۔ عزت، آبرو اور حفاظت نہیں دیتی جو ہر عورت کا جنم ادھیکار ہے تو وہ صدیوں پرانی جانی پہچانی اور آسان راہ اختیار کر لیتی ہے۔ صدیوں سے ایسا ہوتا آیا ہے اور نہ جانے کب تک۔

مُرشد کا گلا رُندھ گیا، وہ چُپ ہو گیا۔

زیادہ باتیں کرنے سے آدمی کی آتمک شکتی ضائع ہو جاتی ہے۔

کم بولو۔ صرف اشد ضرورت کے وقت زبان کھولو۔

جب بولو جو بولو علیمی سے میٹھا بولو، کھرا بولو، سچّا بولو۔

عاجزی، انکسار اور شیریں زبان اچھی تربیت کی نشانیاں ہیں۔ طیش میں آکر جذبات سے مغلوب ہو کر بات کرنے سے بات کی خوشبو اڑ جاتی ہے۔

جو صدیوں سے چلا آرہا ہے اُسے ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ دنیا کو چلانے کا بوجھ ہم پر نہیں، یہ اوپر والے کا کام ہے۔

اپنے کام کو چلانا تو ہمارا کام ہے۔

مرشد کی باتوں میں دخل دینا میرا کام نہیں۔

وہ مُسکرایا۔ اچھائی برائی زندگی کے رنگ ہیں۔ مجھے تسلّی ہے کہ اب بھی عورت کے ضمیر میں سیتا کا خمیر ہے۔ سنجوگتا کی شان اور ہیر کا وقار ہے۔ اس کے برعکس نیلا، نیلی آنکھوں والی لڑکی۔ تمھارے گرتے ہوئے سماج کی شرمناک نشانی ——— مرشد نے حقارت سے تھوک دیا۔

نفرت کرنا بُرا عمل ہے یہ آپ ہی نے سکھایا ہے مجھے۔ رہی نیلا تو میری عرض ہے کہ آپ نیلا کو بلاوجہ ہین ثابت کر رہے ہیں۔ اس نے میری پڑھائی کی تکمیل تک میرا انتظار کیا جب مجھے پھر بھی کوئی نوکری نہ ملی تو اُسے مجبوراً ایک اچھے برسرِ روزگار لڑکے سے شادی کرنا پڑی۔

تعلیم کی تکمیل معاش کی ضمانت نہیں ہوتی۔ جو پیار کرتے ہیں وہ عمر بھر انتظار کرتے ہیں، محبوب کی جدائی کا سوز و گداز اُنھیں عمر بھر تڑپاتا رہتا ہے پل پل کھاتے پیتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے وہ زبان پر اُسی کا نام اور آنکھوں میں اُسی کی تصویر لیے پھرتے ہیں۔

آپ آدرشوں کی بات کر رہے ہیں جب کہ میں اٹل سچائی دیکھ رہا ہوں۔ آخر وہ غریب کب تک امید کی اس بوسیدہ چار دیواری میں گھری رہتی کب تک یوں اس طرح اپنی ذات کو سمیٹے رہتی۔ میں ان کا واحد سہارا تھا جب میں ہی اس کو پناہ نہ دے سکا تو وہ کیا کرتی۔ اس نے بھوک اور افلاس سے نڈھال زندگیاں دیکھی تھیں۔ ہر آدمی موت سے ڈرتا ہے کیونکہ لاش زندہ جسم کی نسبت بھیانک ہوتی ہے۔ نیلا نے مجھے بھی ایک زندہ لاش میں منتقل ہوتے دیکھا تو ڈر گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میرے مفلوج ذہن پر ایک بوجھ اس کا بھی ہے وہ سچی کر سچین لڑکی تھی اس نے جو کیا میں سمجھتا ہوں ٹھیک ہی کیا اور خوفِ خدا کی وجہ سے کیا۔ یہ اس کی سچی مذہب پرستی کا ثبوت ہے اس کے ڈر کی وجہ وہ اذیت ناک جسمانی درد بھی تو تھا جو ایک صحت مند انسان کسی ایسے مرتے ہوئے انسان کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے جو اسے عزیز ہو۔

میں درجنوں بار موت سے ہمکنار ہوا ہوں مگر کسی بھی حادثہ نے میرے ذہن پر کوئی ایسا اثر نہیں چھوڑا جو مجھے موت سے خوف دلائے۔ طوفان میں چٹان کی طرح جم کر کھڑے رہتے ہیں جو ایک امتزاز ہے۔ وہ ایک کشادہ خوبصورت بیڈ روم کے آرام دہ لحاف میں دھنسے رہنے میں کہاں ہوتا ہے۔

"آپ جیسی نڈر شخصیتیں آج کل کتنی ہیں، کہاں ہیں۔ وقت بُرا ہوا تو اسے بدلنے کی جرأت آج کس میں ہے۔ آج کل تو خود اپنی ذات کو بدل سکنے کی سکت بھی آدمی میں نہیں رہی۔ پیار کرنے والے جاتے جاتے بھی زندگیوں کو سنوار جاتے ہیں مر کر بھی اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

جسے مٹانے کے لیے میں آج تمھیں اس نئی ڈگر پر لایا ہوں۔ اس نشان کی صورت یہی تو ہے۔ نہ کہ تم تیس کے ہونے لگے ہو۔ مگر ابھی تک درجن ہو۔ نیلا جو ہے وہ ہے مگر یہ لڑکی نیلا نہیں ہے۔ یہ بمبئی کی بیٹی ہے۔ بمبئی جو نئی تہذیب نئے تمدن کا اتنا بڑا گہوارہ ہے۔ یہ تمھاری نئی تہذیب کی بیٹی ہے۔ یہ میری ——— یہ تمھاری ——— مگر جانے دو۔ تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔

مگر میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ یکا یک اس قدر جذباتی ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا جسم بھلے ہی عورت کا بھوکا ہو، مگر ایسا بھی نہیں کہ میں ———

میں تمھاری بھوک کا خیال کب کا بھول چکا ہوں۔

تو پھر؟ یہ عورت؟

تم نے دیکھا نہیں اُس کے سر کے بال فٹ پاتھ کی گرد سے کیسے اُلجھ گئے ہیں۔ نہ جانے وہ کب سے نہیں نہائی۔ آج وہ گرم پانی سے نہائے گی اور ڈھنگ کا کھائے گی ——— اور ———

اور کیا؟

ایک معمولی پس ماندہ بے سروسامان، گمنام زندگی، افلاس کی بدترین گھٹن کی پیداوار آج غالباً پہلی بار تمھارے شہر کی رنگین فضا اور تمھارے بستر کی جوان اُمنگ بھری شوخ وشنگ آسائش کا ذائقہ لے سکے گی۔

اس کے بعد پھر وہی فٹ پاتھ، پھر وہی جدّوجہد پھر وہی اذیت

خواب لینے کا سلیقہ تو آجائے گا۔ خواب فٹ پاتھ پر بھی گوارا ہو جاتا ہے عزیز۔
لو ہم پہنچ گئے۔ اب تم اُوپر جاکر فلیٹ کھولو اور گیزر آن کر دو۔
شانتی کچھ جھجکا۔ پھر بغیر کچھ کہے چلا گیا۔

اب ڈاکٹر آنے والے مہمان کا انتظار کرنے لگا۔ دیوار سے سٹے ہونے کی وجہ سے اس کا وجود اندھیرے نے نگل لیا تھا مگر اس نے دیکھا کہ آنے والی ٹھیک اسی کی طرف آرہی ہے۔ وہ قریب آگئی تو اس نے دیکھا کہ اُس کی جھولی خالی تھی۔

سب کھا لیے؟

آدھے بابا کو دے دیے تھے۔

بابا کو؟

ہاں!

یہ کیسی عجیب 'ہاں' تھی۔ یہ دوسری 'ہاں' پہلی سے کس قدر الگ تھی۔

ڈاکٹر نے اپنے کانپتے بائیں ہاتھ سے عورت کے سر پر تھپکی دی۔ پھر اُسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ پھر اُس نے اُس کے گالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا بازوؤں کو سہلایا۔ بالکل پدرانہ ڈھنگ سے۔ اُسے لگا وہ اس لڑکی کو جانتا ہے۔ اس کی اپنی لڑکی زندہ ہوتی تو آج اِسی کی عمر کی ہوتی۔

بیتی زندگی کے منتشر اجزا دھیرے دھیرے اکٹھا ہونا شروع ہوئے اور ذہن میں ایک واضح نقشہ ایک باقاعدہ خاکہ کھنچتا چلا گیا۔

اُس کی بیوی، اس کی بچی جو پیدا ہوتے ہی چل بسی اور ساتھ میں ماں کو بھی لے گئی پچیس سال پرانی بات۔

فلیٹ میں پہنچ کر شانتی نے اطلاع کے طور پر اپنے پانچویں مالے کی بالکنی میں روشنی جلادی اور خود باہر آکر کھڑا ہو گیا۔

جیسے ہی ڈاکٹر اور وہ لڑکی اندھیرے سے اُبھرے اور گھر کی طرف بڑھے۔ بتّی ہدایت کے مطابق پھر گُل ہوگئی۔

لڑکی کو لے کر ڈاکٹر بے خوف وخطر اس عمارت کے فائر میں داخل ہوا۔ لفٹ نے منٹ بھر میں دونوں کو پانچویں منزل پر پہنچا دیا۔

جیسے ہی وہ اس تاریک فلیٹ میں داخل ہوئے لڑکی نے محسوس کیا کہ اندھیرے کے باوجود فلیٹ کی ترتیب وترکیب خاصی بانکی اور آرام دہ ہے۔ اُسے لے کر ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور الماری سے زنانہ قسم کا ایک گاؤن نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اُس کو وہیں چھوڑ کر وہ باتھ روم میں گیا۔ اُس نے گیزر کا پانی چیک کیا۔ تو یے دیکھے۔ صابن، تیل، شمپو وغیرہ دیکھا۔ باہر آیا تو اُس نے دیکھا کہ لڑکی کمرہ کے سب سے اندھیرے کونے میں شانتی سے سٹی کھڑی ہے۔

ڈاکٹر مُسکرایا۔ دونوں کو یوں اس طرح ایک ساتھ دیکھ کر اُسے واقعی مسرت محسوس ہوئی۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں اِسے نہلا دُھلا کر بھیجتا ہوں"۔

شانتی چلا گیا تو ڈاکٹر جو اپنے داہنے ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی بوتل تھامے ہوئے تھا کرسی پر بیٹھ گیا اور لڑکی کو اپنے سامنے زمین پر بٹھا لیا۔ اب لڑکی کا سارا بدن اُس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ بھنچا ہوا تھا اور سر اس کی گود میں۔ کتنی ہی دیر وہ لڑکی کے خشک مٹّی سے اٹے بالوں میں تیل سے مالش کرتا رہا۔ اس کا سر اُس کی کنپٹیاں سہلاتا رہا۔ ظاہر تھا کہ لڑکی کو بڑا سکون مِل رہا تھا اور وہ، چُپ چاپ بیٹھی اس قطعی انوکھی کیفیت کے تانے بانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

کیسے عجیب لوگ ہیں یہ

بڑے لوگ واقعی بڑے ہوتے ہیں۔

اس کی سوچ کے دھاگے جو ہمیشہ الجھے رہتے تھے۔ یہ نئی ڈھیل پاکر الگ الگ ہونے لگے اس کا چھوٹا سا دماغ ان دھاگوں کے سرے ملانے جوڑنے اور انھیں کسی ترتیب میں لانے، کسی تکمیل تک پہنچانے میں مشغول ہو گیا۔

کیسے عجیب ہیں یہ لوگ۔

کہتے: مہان

ڈاکٹر کا ہاتھ ایک ہل تھا جو اُس کے سر کی کھردری، جھاڑدار زمین سے خش وخاشاک نکال رہا تھا۔

اس نے سوچا وہ زمین ہے، دھرتی ہے۔ عورت دھرتی ہی تو ہوتی ہے۔ مگر کیا ہل چلانے کے بعد اُسے بغیر بوئے ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ ممکن نہیں۔ مگر بالی یقیناً یہ بزرگ نہیں ہوں گے۔ وہ نوجوان چھوکرا ہوگا۔ وہی ہونا چاہیے۔

کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔

زمین کا اپنا ایک دھرم ہے۔

ہل کا اپنا، اور بالی کا ——————

لڑکی کا سر سہلانے کے بعد ڈاکٹر اسے باتھ روم میں لے گیا۔ جہاں اس نے اس کے کپڑے اتارے۔ کپڑے کیا تھے ایک مختصر سی چولی اور دھوتی۔ دونوں میں جابجا پیوند لگے تھے۔ ڈاکٹر نے لڑکی کے جسم کو مَل مَل کر دھویا اُس کی پیٹھ دھوئی؛ اس کے بالوں میں شمپو کیا۔ اس طرح نہلایا جانا۔ اس کے لیے قطعی نیا تجربہ تھا۔ اُسے لگا اس کی داغ دار مٹیالی زندگی گنگا میّا کے پوتر پانی میں دُھل دُھلا کر ایک دم اُجول ہو گئی ہے۔ اور اُس کے جسم کا سارا کھردرا پن دُھل کر صاف شفاف نکھر آیا ہے اور اس کی جلد ایکدم ریشم کی طرح ملایم ہو گئی ہے۔

اُس نے غسل خانے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ آسمان پر کئی قسم کے رنگ چھائے

انتساب

اپنی چھ محبوباؤں کے نام جن سے میں نے ٹوٹ کر پیار کیا ہے

ہیرا دیوی — میری ماں

مُکتی — میری بیوی

اَمرتا، سُجاتا، گیتا، اور کویتا۔ میری بیٹیاں

ہوئے تھے۔ کالے، سفید، نیلے، ہرے۔ ان رنگوں کی ایک دوسرے سے مواصلت عجب منظر پیش کر رہی تھی، وہ جانتی تھی کہ یہ ست رنگی کمان عارضی ہے اس کا تناؤ عارضی ہے اور چند ہی لمحوں میں سب ڈھیلا پڑ جائے گا۔

اُسے یاد آرہا تھا کبھی ایک جہازی اُسے سمندر کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ وہ بمبئی میں جنمی پلی تھی۔ مگر سمندر کی سیر اُس کا پہلا تجربہ تھا۔ ناؤ کا پانی کو چیر کر چلنا اسے بڑا عجیب لگا تھا۔ پھر جب وہ سپاہی ناؤ بن گیا تھا اور وہ خود پانی کی جامد سطح تو بھی اُسے بُرا نہ لگا تھا۔ پھر یہ تکلیف پُر لطف ہو گئی تھی اور اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ دھرتی ہی نہیں ہے، پانی بھی ہے۔

کتنا خوش مزاج تھا وہ سمندری لٹیرا۔ تب وہ کنواری تھی جبھی تو لٹیرا کا لفظ اس کے ذہن میں آیا تھا۔

اُس کی صاف دل گفتگو اور معصوم ہنسی مندر کی گھنٹیاں تھیں وہ بھرپور مرد تھا مگر اس کی باتیں اس کی آواز میں عورتوں جیسی لوچ تھی۔ توڑے مروڑے بغیر کس طرح اس نے اُسے اپنے اردگرد لپیٹ لیا تھا اور امر بیل کی طرح وہ اس کے گلے سے لگ گئی تھی۔ سپاہی کے تندرست اور توانا کسرتی جسم سے چمٹی ہوئی وہ کیسے ایک دم اتنی چھوٹی ہو گئی تھی۔

سپاہی کی گود اندھیری کی اس پہاڑی کی طرح تھی جس کے غاروں میں اس نے کبھی آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ کیسا خوشگوار گوشہ تھی وہ پیار بھری گود اسے وہ سپاہی آج تک یاد تھا۔ جانے دو اب کہاں ہے اس کی پہلی محبت جس کو بڑے سلیقے سے تہہ کر کے اس نے اپنی یادوں کے کسی کونہ میں سمیٹ کر، سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس طرح تہہ کر کے اور کس کر مختصر بنائی وہ یاد آج کس حد تک تسکن آلود ہو گئی تھی مگر اس کی دلفریب موہنی خوشبو میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ سپاہی کی یاد اُس کی

روح میں رچ بس گئی تھی۔

اور آج

یہ دوسرا خوشگوار تجربہ تھا۔ آج اُس کے دانت صاف تھے۔ زبان صاف تھی۔ سر کے بال صاف تھے اور اس کا سارا جسم اپنے گہری گندمی رنگ کے باوجود جوانی کی اُس مہک سے معطر تھا جو کسی کریم یا عطر کی مرہون منت نہیں ہوتی۔

وہ یکا یک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بلیک پینتھر سپاہی نے اس کے ننگے جسم کو اپنی بانہوں میں جھولتے تولتے کہا تھا۔

''گدگدی ہو رہی ہے'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

نہیں ایسے ہی کچھ سوچنے لگی تھی۔

کیا!!

یہی کہ مجھے نہلاتے ہوئے بلکہ دھوتے ہوئے آپ نے اپنے سارے کپڑے گیلے کر لیے۔

ایسا تو ہونا ہی تھا۔

سو تو ہے ــــــ مگر

مگر کیا!

آپ مجھے ایسے نہلا رہے ہیں جیسے ایک عورت دوسری عورت کو نہلاتی ہے، یا پھر ــــــ

یا پھر؟

نہیں کہوں گی

کہو!

نہیں!

ارے بھئی کہہ بھی چکو میں برا نہیں مانوں گا۔

آپ ایسے نہلا رہے ہیں مجھے جیسے کوئی ماں یا شفیق باپ اپنے نوعمر بیٹے یا بیٹی کو نہلاتا ہے۔

ڈاکٹر ہنس پڑا۔

آپ نے برا نہیں مانا۔

اِس میں برا ماننے کی کیا بات ہے تم میری بیٹی کی طرح ہی تو ہو

اب تم یہ گاؤن پہن لو۔ آج کی رات تم دُلہن ہو اس ویران گھر کی رونق۔ جس گھر میں کانچ کی چوڑیاں کبھی نہ کھنکھناتی ہوں اُس کی کنواری اُداسی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ آج یہ اُداسی دور ہو جائے گی۔ 'دلہن' ——— کیسا پیارا کتنا میٹھا لفظ ہے۔ ایک رات کی ہی سہی وہ دُلہن بنی تو ———

وہ غسل خانے سے باہر آئے تو ڈاکٹر بلند آواز سے بولا "میں بہت تھک گیا ہوں شانتی۔ اب ذرا سوؤں گا۔ تم لوگ نبٹ چکو تو مجھے جگا لینا اور ہاں کمرے میں بتّی نہ جلانا یہاں اروس پڑوس"

اور فقرہ مکمّل کیے بغیر ہی وہ اپنے کمرے میں چلا گیا ———

شانتی نے جو آج شام سے ہی اپنے خضر کا ہر حکم ایک نو زائیدہ بچّہ کی سی حیرت سے سُن اور مان رہا تھا کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر کے غسلخانے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا بستر جھاڑ پونچھ کر ایسا صاف اور سیدھا کر دیا تھا کہ اب اُس میں ایک بھی شکن باقی نہ رہی تھی۔ کپڑے اتار کر اب وہ اپنی دُھلی دُھلائی گدرائی نوجوان رات کی ساتھی کا بڑے اشتیاق سے انتظار کر رہا تھا۔ آج شام اس نے کتنے ہی سگریٹ پی ڈالے تھے۔ پچھلے کچھ منٹوں میں بھی اُس نے چار چھ پھونک ڈالے تھے۔

غسل خانے کی چکا چوند روشنی سے باہر اندھیرے میں آکر لڑکی جو اب ایک

اندھے کی طرح محسوس کر رہی تھی چپ چاپ شانتی کے بیڈ روم کی دہلیز پر کھڑی مزید حکم کا انتظار کرنے لگی۔ شانتی نے آگے بڑھ کر اُسے شانوں سے پکڑا اور بڑی شوخی سے سگریٹ کا دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے اس کی ستواں ناک پکڑلی۔

"تمہاری ناک کتنی چھوٹی ہے۔"

دُھلی دُھلائی تم کتنی خوشگوار لگنے لگی ہو۔

اُنھوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے نہلایا ہے۔

صرف نہلایا ہی نہیں۔

لڑکی کو نہ جانے کیوں یہ جملہ اچھا نہیں لگا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شانتی نے اپنے مرشد کی سوجھ بوجھ کی دل ہی دل میں تعریف کی۔ نہا دھو کر اور نائٹی پہن کر لڑکی واقعی بے حد چست لگ رہی تھی۔ سوکھے میوے کھا کر اور اس طرح گرم پانی سے نہا کر لڑکی کا جسم اور من کونپلوں کی طرح کھِل اٹھے تھے۔

شانتی نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھے۔ کمر پتلی تھی

"بلیک پنیتھر" جہازی نے کہا تھا۔

پھر اس نے ہاتھ اوپر بڑھا دیے، پھر اور اوپر بڑھا دیے اور پھر کندھوں سے پکڑ کر اندھیرے ہی میں اُسے دیکھنے کی کوشش کی۔

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اُس نے لڑکی کے چہرہ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کے ہونٹ چوم لیے۔ پھر اُس نے اُسے کئی بار چوما۔ ہونٹوں پر، جبیں پر، گردن کے خم پر، گالوں پر، ماتھے پر، سر پر اُس کے ہونٹ کچھ پا لینے کی تلاش میں سرگرم غلطاں تھے۔ اُسے اس لڑکی پر واقعی پیار آ رہا تھا۔ کتنا متناسب جسم تھا۔ اُس کا بھوک اور افلاس کے باوجود گٹھا ہوا مضبوط۔

بدن کے بھیدوں سے ناآشنا کنواری لڑکی کی طرح وہ شانتی کے ناتجربہ کار

گرم ہاتھوں میں موم کی طرح پگھلنے لگی پگھلتی گئی تا وقتیکہ وہ ساعت آگئی جو تسلسل حیات کی ضامن ہوتی ہے۔ دونوں کو ایسے لگ رہا تھا گویا انھیں عمروں سے اسی ساعت کا انتظار ہو۔

عورت کا پیار چیتن مایہ ہے، جو اپنی ظاہری مٹھاس سے آدمی کو چھلتی ہے۔
وہ مایا سہی، موہ سہی، جوانی کا ولولہ سہی مگر یہ جھوٹ نہیں ہے۔
یہ سچ ہے، اٹل سچ ہے۔
اے کاش یہ رات کبھی ختم نہ ہو
آفتاب کبھی نہ نکلے۔

زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے محض اسی کے لیے زندہ رہنا بھلے ہی معیوب ہو مگر زندہ رہنے کے لیے۔

آدمی اور عورت

عورت اور آدمی

ایک دوسرے کا نصب العین

وہ جاگ رہے تھے اور سو رہے تھے۔ جاگتے ہوئے سونا کیسی لطف آمیز کیفیت ہے۔ کیوں نہ وہ اسے مستقل طور پر رکھے۔ مرشد کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور مرشد کے علاوہ کسی کے اعتراض کی اُسے پروا نہیں۔

وہ ایک دوسرے میں ——————

یہ قبروں کا نہیں، دلوں کا ملاپ ہے۔

جب میں تھا وہ نہیں تھی اب وہ ہے میں نہیں ہوں۔ دُوری ٹوٹ رہی تھی اہم ٹوٹ رہا تھا تُو اور میں کا جھگڑا ختم ہوگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس کا وجود مٹ جائے ہوا ہو جائے۔ اور وہ سارے کا سارا ثابت و سالم اپنی ہم بستر کے وجود میں گھس جائے۔

مگر انسان کے جذبات میں اتنی شدت کہاں ہوتی ہے۔ ہوتی بھی ہے تو کب تک۔

ہر چیز پیدا ہوتی ہے۔

بڑھتی پھیلتی اور پروان چڑھتی ہے۔

بالآخر مٹی ہو جاتی ہے۔

ازلی

ابدی

سرمدی

کچھ نہیں

ساڑھے تین بج رہے تھے جب شانتی نے ڈاکٹر کو جگایا۔

وہ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

نہیں نہیں، شانتی ایسا نہ کہو ——— وہ ——— وہ میری ——— مگر اُس نے زبان کو تشریح سے روک دیا۔

ایک لمحہ بھر میں شانتی کے ذہن وضمیر پر جیسے بجلی سی کوند گئی اور وہ سرتاپا لرز گیا۔ سڑک پر کہی ہوئی ڈاکٹر کی بات اُسے یاد آنے لگی۔

تو کیا اُس نے ڈاکٹر کی بیٹی سے، وہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔

نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب بلاوجہ جذباتی ہوگئے ہیں۔ آخر بیچارے اتنے بوڑھے بھی تو ہیں۔

ہر تیس سال کے آدمی کو پچاس پچپن کا آدمی بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔

جب وہ اپنے کمرے میں واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ لڑکی ڈاکٹر کی دی ہوئی نائٹی اتار کر پھر سے اپنی پرانی چولی اور ساڑی پہن رہی ہے جیسے اُسے معلوم ہوگیا ہو کہ اس کا کام ختم ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر بھی شانتی کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ دونوں نے ہی یہ منظر دیکھا۔ جب وہ اپنے چیتھڑے پہن چکی تو ڈاکٹر اسے باہر لے گیا۔

نہ دعا

نہ سلام

نہ پھر ملنے کا وعدہ

تھوڑی دیر بعد لڑکی کو نیچے سڑک تک پہنچا کر ڈاکٹر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ شانتی تو غیر معمولی طور پر بوکھلایا ہوا کمرہ میں چکّر پہ چکّر کاٹ رہا ہے۔ جب ڈاکٹر نے اس کی اس نئی بوکھلاہٹ کی وجہ نہ پوچھی تو وہ خود ہی چیخنے لگا۔

آپ نے اسے دیکھا!!!

میں نے اسے سو نمبر کے بلب کی روشنی میں خود اپنے ہاتھوں سے نہلایا تھا ظاہر ہے کہ میں نے اُسے دیکھا تو ہوگا ہی۔

ابھی ابھی جو ہوا آپ نے وہ بھی دیکھا؟

کیا ہو گیا اس بیچ! ڈاکٹر نے کھینچ کر پوچھا۔

"آپ کہتے تھے وہ عورت فاحشہ نہیں ہے، رنڈی نہیں ہے، روٹی کے لیے جسم کا بیوپار کرنے والی عورت فاحشہ نہیں ہوتی، تاجر ہوتی ہے۔ وہ جیسے ہی نیچے اتری کسی اجنبی نے اُسے دبوچ لیا اور وہ بلا حیل و حجّت اُس کے ساتھ بھی چلی گئی ——— میں شرم سے مرا جا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں نے ابھی ابھی گندے نالے کا پانی پیا ہو اور "ابھی چند ہی منٹ پہلے اس کا بدن مجھے پھولوں جیسا دلکش لگا تھا ——— اور اب۔"

"ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے کیچڑ سے سَنا ہوا ہاتھ تمہارے مُنہ پر تمھارے سارے جسم پر پھیر دیا ہو" ڈاکٹر طنزاً غرّایا۔ "ایسی ہی بات تھی تو تم نے اُسے جانے ہی

کیوں دیا تھا ہمیشہ کے لیے رکھ کیوں نہ لیا اپنے ساتھ ——

"آپ"

"بکو مت۔ تم بیمار ہو۔ تمہارا ذہن بیمار ہے تمہارا ضمیر بیمار ہے۔ اس لڑکی سے تمہارا رشتہ اس کے اس فلیٹ کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی ختم ہو گیا تھا —— اپنی شرمناک کمزوری اور بزدلی کو تم اس کی بے حیائی کہہ کر تسکین پانا چاہتے ہو —— تم نے اس کے ساتھ وہی کیا جو صدیوں سے اُس کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ پھر —— مناسب یہی ہے کہ اب تم سو جاؤ —— اور بھول جاؤ"

وہ بستر پر لیٹ تو گیا، مگر کوئی شے تھی جو اس کے دل و ذہن کو کرید کرید کر کھا رہی تھی کچھ ایسی کیفیت جیسے وہ مر گیا ہو اور ننھے ننھے چوہے اس کا سارا وجود چپکے چپکے کترتے جا رہے ہوں۔

ڈاکٹر نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ اب میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔ توقع اسی سے ہوتی ہے جس سے کوئی رشتہ ناطہ ہو۔

صبح آٹھ بجے کے قریب شانتی کی نیند اچانک کھل گئی۔ کہیں کوئی شور تھا جس نے اُسے جگا دیا تھا۔ اس نے دیکھا ڈاکٹر شب خوابی کا لباس اور گاؤن پہنے بالکنی میں کھڑا سگار کے لمبے لمبے کش کھینچ رہا ہے۔ اور بے حد بے چین ہے۔ باہر آ کر اس نے دیکھا کہ نیچے سڑک پر بہت سے لوگ جمع ہیں اور گہرے گندمی رنگ کے ایک بڑی ہی قبول صورت اور جوان لڑکی دھن پت رائے بلڈنگ کے چوکیدار کا گریبان پکڑے چلا چلا کر اسے گالیاں دے رہی ہے۔

"حرامزادے"

"حرام خور"

"ماں کے خصم"

دونوں کے چاروں طرف خاصی بھیڑ اکٹھی ہوگئی تھی جو بڑھتی جارہی تھی۔
لڑکی چوکیدار سے کچھ مانگ رہی تھی جو غالباً اس کے پاس نہیں تھا۔
تھوڑی دیر میں پولیس بھی آگئی۔
ڈاکٹر اندر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سر زانوؤں تک جھک آیا۔
وہ سوچ رہا ہے۔ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ آج اچانک اس بے پناہ ذہین فلسفی کو کیا ہوگیا ہے۔

اُس نے بڑے احترام سے ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیوں بلاوجہ اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا کے چلانے کا ذمہ ہمارا آپ کا ہی تو نہیں ہے۔"

جب دیر تک ڈاکٹر نے سر اُوپر نہ اٹھایا تو شانتی پھر بالکنی میں چلا گیا۔
نیچے پولیس اُن دونوں کو پکڑے لیے جارہی تھی اور لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔
اڑوس پڑوس کی عورتیں اور مرد حقارت سے ناک بھوں سکوڑ رہے تھے۔ شانتی نے دیکھا اس نفرت کے ایکسپریشن میں اُستاد سلطان احمد کی فلمی ایکسٹرائیں بھی شامل ہیں۔

چائے پیتے پیتے ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "اِس ہنگامے کی آواز سُن کر میں نیچے گیا تھا کیونکہ میں ڈر گیا تھا کہ وہ لڑکی کہیں ہمیں بھی ساتھ نہ لپیٹ لے۔"

"سو کیوں؟"

"کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی جو رات تمہارے ساتھ ——————"

چائے کا پیالہ شانتی کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

ڈاکٹر کہتا گیا، میں نے دیکھا کہ اس نے مجھے پہچان کر بھی پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ جیسے وہ اس سے پہلے مجھ سے کہیں نہ ملی ہو۔ جب یقین ہوگیا کہ وہ ہمیں اس نئی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ترتیب

رہٹ (بطور دیباچہ بھی)

کابوس

مقدس کتاب

بمبئی

دھند میں لپٹی اک یاد

بنے پیٹ کے ہم جو گاماں

مثلث

ہائی پو کونڈریاسس

مہک

بلاعنوان

رام اور سیتا

اُلجھن میں نہ گھسیٹے گی تو میں واپس چلا آیا۔ تم بھی اطمینان رکھو۔ اس نے تمھیں بھی معاف کر دیا ہے۔"

جب شانتی نے کوئی جواب نہیں دیا تو ڈاکٹر کہنے لگا "ہے نہ حیرانی کی بات ۔ ایک غریب چوکیدار جس کو بمشکل دس روپیہ ماہانہ ملتا ہے۔ جس کا سارا جیون پیسہ پیسہ جوڑنے گزر جاتا ہے اور جس کے لیے ایک پورا روپیہ ایک معنی رکھتا ہے کسی سے کھوٹا روپیہ کیوں لے گا۔ کھوٹا روپیہ اُس کے پاس کہاں سے آئے گا۔ اگر آئے گا نہیں تو وہ کسی کو دے گا کیسے۔"

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

صبح کی ساری لے دے کی وجہ ایک کھوٹا روپیہ تھا۔ وہ لڑکی بضد تھی کہ وہ کھوٹا روپیہ اسے اُس چوکیدار سے ملا تھا۔

تو وہی اُس چوکیدار کے ساتھ گئی تھی ۔ اگر وہ اُس کے ساتھ گئی تھی تو ظاہر ہے کس لیے گئی تھی۔ اور اگر چوکیدار نے اسے روپیہ دیا تو ظاہر ہے کہ کیوں دیا، کس کام کے عوض دیا اور اگر جو روپیہ اُسے چوکیدار سے ملا۔ کھوٹا ہے تو ظاہر ہے کہ ——

ہو سکتا ہے، "کچھ ظاہر نہیں ہے تم کچھ نہیں سمجھے شانتی نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔

کھوٹا روپیہ اس کے پاس کہاں سے آیا

"وہ کھوٹا روپیہ اُسے ہم نے دیا تھا۔"

شانتی ایک دم سرد پڑ گیا۔

ایک روپیہ اُسے ہم سے ملا۔ ایک اس غریب چوکیدار سے ۔ ایک ہی رات میں ایک ہی کام کے عوض مگر اُس نے بغیر سوچے سمجھے طے کر لیا کہ وہ کھوٹا روپیہ اُسے ہم نے نہیں دیا چوکیدار نے دیا ہے۔ ہم بھلا ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ ہم جو معزز معتبر آدمی ہیں، بڑے لوگ ہیں، کہتے کہتے ڈاکٹر کا گلا رُندھ گیا۔

"میں نے اُسے چاندی کے دس روپے دیے تھے اُوپر آکر میں نے دیکھا کہ وہ نو روپے یہیں چھوڑ گئی تھی۔ غالباً ——— اور جو ایک روپیہ وہ لے گئی تھی وہ کھوٹا تھا۔ یہ وہی روپیہ تھا جو تم نے مجھے بنک سے بدلوانے کے لیے دیا تھا۔ ان دس روپیوں میں وہی ایک کھوٹا روپیہ تھا۔

شانتی کے دماغ میں ایک چھن سی آواز اُبھری۔ جیسے گرم توے پر تیل کا قطرہ گرنے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے کانوں کی لویں تک سُرخ ہو گئیں۔ اس کے اعصاب تن گئے۔

"نہیں نہیں شانتی تم مجھے اس طرح نہ گھورو۔ یہ جان بوجھ کر نہیں غلطی سے ہو گیا۔ میں جھگڑا مٹانے گیا تھا۔ مگر کچھ نہ کر سکا۔ اپنے طبقہ کے جھوٹے نام و ناموس میرے راستہ میں آگئے۔

اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور دیر تک کچھ نہ بولے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ ایک رات کی آسودگی

اور یہ دام

"جرم و سزا کا کوئی ناپ تول نہیں ہوتا۔ پروفیسر نے پائپ سلگاتے ہوئے شانتی کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "اب جب کہ ہم سب کچھ جان گئے ہیں تو بلاوجہ ملول ہونے سے فائدہ!"

چلو اندر ——— چائے بناتے ہیں۔

مقدّس کتاب

سگریٹ کی ڈبیا کے ماڈل پر بنی چھ منزلہ عمارت، ریڈ پرک ہاؤس، میں چوبیس فلیٹ تھے۔ چوبیس گرہستیوں کی ملکیت۔

بڑے مزے کی زندگی تھی اس عمارت کے مکینوں کی۔ ہندستان کی مختلف زبانوں، علاقوں اور مذاہب سے وابستہ یہ لوگ بھائیوں کی طرح مل کر رہتے تھے۔ اس طرح کی دوستانہ فضا آس پاس کی کسی عمارت کو میسر نہ تھی۔ ایک پُرلطف خصوصیت یہ بھی تھی اس عمارت کی کہ اس کے کسی فلیٹ کا کوئی حصہ آس پاس کے کسی دوسرے فلیٹ یا پاس پڑوس کی کسی دوسری عمارت کے کسی بھی کونے سے نہ دیکھا جا سکتا تھا، نہ آمنے سامنے سے، نہ اوپر نیچے سے، جبکہ اس عمارت کے مکین اپنی بالمقابل عمارتوں کے فلیٹوں کو بڑے مزے سے جم کر دیکھ پرکھ سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ دیکھتے پرکھتے رہتے بھی تھے، یہ واقعی مزے کی بات تھی کہ ان لوگوں جیسی برائی ویسی قریب و جوار کی کسی دوسری عمارت کے مکینوں کے حصے میں نہ آئی تھی۔

یہ لوگ جب بھی ایک دوسرے سے ملتے پاس پڑوس کی عمارتوں میں ہو رہے ڈراموں کے تذکرے بڑے مزے لے لے کر چھیڑتے۔

کس کے ہاں کون آتا ہے۔ کب آتا ہے۔ کہیں کبھی کوئی نہیں آتا تو کیوں نہیں آتا یہاں تک کہ جو جہاں جب تب آتا جاتا ہے تو کیوں آتا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو تو یہ بھی علم تھا کہ کس گھر میں کیا ہے، یا کون کون ہے۔ اور کون کیسا ہے یا کون کیسی ہے۔

یہ لوگ سب کچھ دیکھتے اور مرچ مصالحہ لگا کر ایک دوسرے کو بتاتے۔

آج پھر آیا تھا

کون ؟

بھئی وہی .... سرخ لوٹیی والا ڈرائی فرنٹ مرچنٹ

یہ عورت نام کی فلم آرٹسٹ ہے ۔

اور اس کا شوہر بھی نام ہی کا شوہر ہے

سالا بھڑوا ہے

ہر فلمی ایکسٹرا آرٹسٹ نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ ــــــــــــ

کچھ بھی ہو عورت ہے کالی مرچ ۔ کیا سانپ ایسا لچکیلا بدن ہے اس کا ، ٹوپی والے کو جب تک تھکا کر چُور نہیں کر دیتی قریب نہیں جاتی ۔

کیا موتیوں ایسے دانت ہیں ۔ گاڑ دیتی ہوگی ٹوپی والے کے جسم میں کہیں نہ کہیں اور ان کے میٹھے زہر سے مدہوش ہو جاتا ہوگا سالا ۔

اس کا شوہر کیا کام کرتا ہے ۔

شوہر کا لیبل پہنے لڑاکو مرغ کی طرح تنا گھومتا ہے

بھئی کچھ نہ کرنا بھی تو کام ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ سب کاموں سے مشکل کام یہی ہے ۔

سات نمبر والی سات چھوکریوں کی اکلوتی ماں کیسے ہر دم چہکتی پھرتی ہے اپنی ان چھوکریوں اور ان کے یاروں کے ساتھ ۔

بڑی بے حیا ہے ۔

کیسے عجیب و غریب فرانسی الطالوی اور اسپہانی ترانے بجتے رہتے ہیں ان کے اسٹیریو پر ۔

سات بیٹیاں جننا کوئی معمولی معرکہ نہیں ۔ اپنی محنتوں کا عوضانہ ہی تو وصول کر رہی ہے ۔

کون جانے یہ سب کی ماں ہے بھی کہ نہیں ۔

صرف ایڈوانی والا ہی ایک فلیٹ جس کے آجو باجو کسی قسم کی دل چسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس فلیٹ کے دائیں بائیں دوسری عمارتوں کے جو فلیٹ تھے ان میں ان میاں بیوی کی دل چسپی کا ایسا کچھ نہ تھا جس کا تذکرہ وہ دوسروں سے کرتے۔ دائیں بائیں ایک بوڑھے میاں بیوی رہتے تھے۔ جو ہر وقت لڑتے جھگڑتے یا تاش کے کھیل میں مشغول رہتے۔

بائیں جانب ایک ادھیڑ عمر کی کوئی عیسائی عورت رہتی تھی۔ کسی نے کبھی اسے کسی سے بات کرتے نہ دیکھا تھا۔ ایڈوانی اور اس کی نیک سیرت بیوی اس عورت کی ذات سے بے حد متاثر تھے۔ وہ اپنے فلیٹ کی بالکنی میں بیٹھی ہر دم ایک موٹی سی غالباً مذہبی قسم کی کوئی کتاب پڑھتی رہتی تھی۔ اسے ہنستے، روتے یا گاتے گنگناتے بھی دونوں میں سے کسی نے کبھی نہ دیکھا تھا

ہر اکیلا آدمی، کبھی نہ کبھی تھوڑا گا کر، بھلے ہی اس کی آواز بھونڈی ہو، اپنا من بہلاتا ہے مگر یہ عورت ہمیشہ چپ رہتی تھی، گویا گونگی ہو۔ وہ ہر صبح نور کے تڑکے گھر سے نکلتی اور سورج کی پہلی کرن کے اجاگر ہونے سے پہلے ہی گھر لوٹ آتی، پھر سارا دن گھر ہی میں بند رہتی، وہ کب کھاتی پیتی اور پہنتی تھی کسی کو معلوم نہیں تھا البتہ ایک بات مسز ایڈوانی ہمیشہ نوٹ کیا کرتی تھیں۔ وہ ہر صبح ایک خاص وقت پر تقریباً آدھا گھنٹہ ایک مردانہ کوٹ اوڑھے مسیح کے مجسمہ کے سامنے سرنگوں رہتی۔ اس قسم کا غالباً ایک ہی کوٹ تھا اس کے پاس، عبادت کے بعد وہ اس کوٹ کو بڑے اہتمام سے اتارتی۔ پیار سے اور اطمینان سے اسے دیکھتی پرکھتی اور پھر ذرا سا جھاڑ کر ہینگر میں ڈال کر گارڈریج کی الماری میں مقفل کر دیتی۔ یہ معمول تھا جس سے وہ کبھی نہ چوکتی تھی۔

ایک دن مسز ایڈوانی نے نوٹ کیا کہ وہ اس مردانہ کوٹ کو گھر ہی میں نہ پہنتی تھی ہر اتوار کو چرچ جاتے وقت بھی وہ اسی میں ملبوس دیکھی جاتی۔ اس عورت کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار ایک خاص قسم کی تمکنت تھی اور لوگ اسے آتے جاتے دیکھ کر اکثر راستہ سے احتراماً ہٹ جاتے تھے۔

واٹر فرنٹ دیہی اس بلڈنگ کا نام تھا جس میں اس عجیب و غریب ہستی کا قیام تھا، کا ہر مرد، عورت، اور بچہ اس عورت کی عزت کرتا تھا۔ ہر کوئی اس کے فلیٹ سے نکلنے اور

واپس لوٹنے کو کچھ اس اشتیاق سے دیکھتا تھا گویا وہ کوئی نامی فلم اسٹار ہو، کوئی معمولی عورت نہ ہو، لوگ اس کی دبی دبی مگر دل کش مسکراہٹ میں اساطیری دیویوں کا جلال دیکھتے تھے، ہوا تھی کہ جو کوئی اسے ایک نظر دیکھ لیتا ہے اس کا وہ دن بڑے مزے سے گزرتا ہے۔ خود ایڈوانیز نے بھی یہ محسوس کیا تھا۔ وہ اسے ہر روز دیکھتے تھے۔ ایڈوانی تو اسے دیکھے بغیر کام پر بھی نہ جاتا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ فلیٹ لینا اس کے لیے بڑا مبارک ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی دکان جو پہلے بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی کا وسیلہ تھی بڑھتے بڑھتے ایک بڑا ریستوران بن گئی تھی۔

میرے جی میں آتی ہے ایک دن بڑھ کر اس مقدس عورت کے پاؤں چھولوں اس کے پاؤں کی دھول روز ماتھے پر لگاؤں، سچ کہتا ہوں میراں یہ عورت ہمارے مقدر کا ستارہ ہے اس کے دیکھنے سے راحت تو ملتی ہی ہے دیکھتا ہوں تو تقدیر بھی چمک جاتی ہے۔

پھر ایک دن نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے چرچ سے لوٹتی ہوئی اس مہان آتما کو بلا ہی لیا۔

"آپ واٹر فرنٹ کے فلیٹ نمبر دس میں رہتی ہیں نا"

عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں ریڈ برک ہاؤس میں رہتا ہوں۔ میرا فلیٹ آپ کے فلیٹ کے بالکل سامنے ہے۔ ہم میاں بیوی اکیلے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کبھی کبھار ہمارے غریب خانہ کو بھی نوازا کریں ہمیں آپ سے بے پناہ عقیدت ہے۔ آپ سچ مچ ایک دیوی ہیں۔ اگر آپ ہماری یہ درخواست منظور فرمالیں گی تو ہم اپنے آپ کو دھنیہ سمجھیں گے"۔۔۔۔۔ یہ ایک پوری تقریر تھی جو اس کی زبان سے نہیں دل سے نکلی تھی۔

عورت مسکرائی، وہی دبی دبی دلفریب زیر لب مسکراہٹ، پھر کافی دیر تک مسٹر ایڈوانی کی طرف بلا جھجھک دیکھتی رہی۔ جب وہ بولی تو مسٹر ایڈوانی نے محسوس کیا کہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ خود مریم ہے۔ دیا کی دیوی۔ اس کی آواز میں جو بے انتہا مترنم تھی ایک عجیب قسم کا جلال تھا۔ جسے ہم سمجھتے ہیں کہ دیوی دیوتاؤں کی آوازوں میں ہوتا ہوگا

"آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں بے حد مشکور ہوں بھائی صاحب مگر میں ایک بدنصیب عورت ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ میرا منحوس سایہ کسی خوش نصیب گھر پر

پڑے ۔" یہ چند جملے عورت نے کچھ اس طرح سے کہے تھے کہ ایڈوانی کے لیے مزید کچھ کہنا ممکن نہ ہوا۔

یہ ان کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

ایک روز فلیٹ نمبر ۹ کے سردار سردول سنگھ نے جو ایک جوہری کی دکان پر حال ہی میں ملازم ہوا تھا، ایڈوانی کو بتایا کہ مسز جیمز دیہی اس محترمہ کا نام تھا، آج اس کی دکان پر سونے کی ایک چوڑی بیچنے آئی تھی، اور اس کے ساتھیوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ پچھلے چھ سال سے ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک چوڑی یا کوئی دوسرا زیور فروخت کر جاتی تھیں اور غالباً یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ ایڈوانی کو یہ سن کر بڑا صدمہ پہونچا۔ بیچاری بیوہ کے پاس جو کچھ تھا غالباً اسی کو وقتاً فوقتاً بیچ کر اپنا گزر بسر کرتی ہے، اے کاش وہ اس کی کچھ مدد کر سکتا۔

پھر ایک دن اس کے لفٹ مین نے بتایا کہ مسز جیمز اپنا کچھ فرنیچر بیچنا چاہتی ہیں۔ وہ خود تو نہیں گیا مگر اس نے اپنی بیوی اور اپنے ریستوراں کے منیجر کو یہ کہہ کر بھیجا کہ محترمہ جو کچھ بھی بیچنا چاہیں وہ جیسا اور جس حالت میں بھی ہو تگنے چوگنے داموں سے خرید لیا جائے۔ شام کو اس نے دیکھا کہ اس کے فلیٹ کا ایک کمرہ فرنیچر سے لبالب بھرا ہوا ہے ہر آئیٹم پر داموں کی چٹ لگی ہوئی تھی جو بڑے ہی واجبی تھے۔ فرنیچر کا ہر آئیٹم محترمہ کے اچھے دنوں اور سلجھے ہوئے مذاق کا گواہ تھا۔ اس کی بیوی میراں نے بتایا کہ انھیں مسز جیمز سے کسی آئیٹم کے بارے میں پوچھ تاچھ کا موقع ہی نہیں ملا تھا، ہر آئیٹم پر پہلے ہی داموں کی چٹ پیوست تھی۔ ہم فرنیچر دیکھتے رہے اور وہ بدستور اپنی بالکنی والی اسی کرسی پر بیٹھی رہیں جہاں ہر روز بیٹھ کر وہ غالباً بائبل کا مطالعہ کیا کرتی تھی۔

میراں ایڈوانی منہ مانگے دام دے کر بھی خوش نہ تھیں وہ چاہتی تھیں کہ اپنی خوشحالی جیسے وہ اور ان کا شوہر اس مہمان آتما کے روزانہ درشنوں سے منسوب کرتے تھے اس سے جہاں تک ممکن ہو بانٹ لیں مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئی تھی۔ اس نے اپنی چیزوں کے وہی دام مانگے، بلکہ لکھ چھوڑے تھے جو عین واجبی تھے ——

اس گھر میں اور بھی بہت کچھ ہو گا

کبھی ضرور رہا ہو گا مگر اب تو صرف یہی فرنیچر تھا۔ رسوئی میں کھانا پکانے کے برتن

بھی چند ہی تھے۔ اس نے ہر وہ سامان جو اس کے لیے غیر ضروری تھا اٹھوا دیا تھا۔ اب لکھنے کی ایک چھوٹی سی میز، کرسی اور ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ ایک گارڈ ڈیچ کی الماری ایک بڑا ٹرنک دو اپیچی اور وہ آرام کرسی ہی بچی تھی جس پر بالکنی میں وہ اکثر بیٹھا کرتی ہیں۔

مینیجر نے یاد دلایا کہ ان چند اشیاء کے علاوہ سب کمروں میں ایک ہی آدمی کی درجنوں تصویریں ٹنگی تھیں اور بڑے کمرے میں نقلی فائر پلیس کے اوپر مسیح کا ایک بڑا ہی من موہک دھات کا مجسمہ جو اطالوی کاری گری کا بہترین نمونہ تھا رکھا تھا۔

یہ آدمی غالباً اس عورت کا شوہر تھا، بیٹا بھی ہو سکتا ہے۔ بھائی اور باپ بھی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کیوں کہ سب کی سب تصویریں پرانی تھیں اور ماڈل ایک نہایت وجیہہ نوجوان تھا۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مسز ایڈوانی نے کہا

کون سی بات ؟

تو نے دیکھا رامچندر وہ ڈبل بیڈ اور لکھنے کی خالص مردانہ قسم کی وہ میز !

اب جب کہ آپ نے بتایا ہے تو یہ اشیاء میرے ذہن میں بھی کھٹکنے لگی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ابھی بھی اسے کسی کا انتظار ہے۔

چار ہزار روپے بہت ہوتے ہیں۔ وہ مزے سے سال دو سال کاٹ سکتی ہے۔

وقت پھر اپنی پرانی رفتار سے چلنے لگا تھا۔ صبح کی سیر۔ اتوار کا چرچ۔ بالکنی میں بائبل کا گھمبیر مطالعہ اور اسی مردانہ کوٹ میں ہر صبح مسیح کی پرستش۔ حیرت تھی کہ وہ کوٹ اتنے سالوں کے استعمال کے باوجود نیا لگتا تھا۔

دو سال بیت گئے۔

پھر ایک اتوار کو انہوں نے دیکھا کہ وہ چرچ نہیں گئی۔ اس روز وہ بالکنی میں بھی نہ بیٹھی۔ دوسرے دن بھی انھوں نے اسے نہ دیکھا، تیسرے دن پڑوسیوں نے نوٹ کیا کہ اس نے باہر سے دودھ کی بوتلیں بھی نہ اٹھائی تھیں۔ کافی غور و خوض کے بعد لوگوں نے اس کے دروازہ پر دستک دی۔ پہلے ہولے ہولے تمیز سے مگر جب کافی انتظار کے باوجود جواب نہ ملا تو لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ کمرے کے اندر سے عجیب قسم کی بو آ رہی تھی۔

واٹر فرنٹ اور ریڈ برک ہاؤس کے سارے مکین جمع ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ پولیس کو خبر دی جائے۔

پولیس آئی اور دروازہ توڑ دیا گیا۔

لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے پلنگ پر سو رہی ہے یہ وہی ابدی نیند تھی جس کے بعد کبھی کوئی نہیں اٹھتا۔ درجنوں تصویریں فریموں سمیت اس کے اردگرد پلنگ پر پھیلی پڑی تھیں اور اس کے سینہ پر ایک بڑی البم رکھی تھی۔ جسے ایک نظر دیکھ کر ہی ایڈوانی نے پہچان لیا تھا۔اس کے بوڑھے مگر دل کش چہرے پر وہی جلال رقصاں تھا، جو اس کی پہچان کے طور پر ہر کسی کی یاد بن گیا تھا۔ جسے وہ بائبل سمجھتا تھا وہ ایک فوٹو البم تھی

البم میں اسی ایک آدمی کی تصویریں تھیں۔ پرانی البم پرانی تصویریں

تصویریں ایک بڑے ہی خوبرو نوجوان کی تصویریں۔

دیواروں والی تصویریں۔

البم والی تصویریں۔

سب اسی ایک آدمی کی۔

وہ کون تھا؟ اس کا شوہر، بیٹا۔ بھائی، باپ یا محبوب ؟

تفتیش سے پتہ چلا کہ آٹھ سال پہلے مسز جیمز نے جب یہ فلیٹ بیس ہزار میں خریدا تھا تب بھی وہ اکیلی تھیں۔ صرف نام سے ظاہر تھا کہ وہ شادی شدہ تھیں۔ کاغذات میں اس نے اپنا نام لیلا جیمز نی سٹیفن لکھوایا تھا۔

لوگوں نے نا مسٹر سٹیفن کو کبھی دیکھا تھا نہ مسٹر جیمز کو۔

مرحومہ کے نیک چال چلن اور اچھے برتاؤ کی وجہ سے کبھی کسی نے یہ سب کریدنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی

ہر چہرے پر ایک ہی سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا

سب کے سارے سوالوں کا مرکز اس عورت کا جسم لوگوں نے احترام سے ڈھانپ دیا تھا اور اور عقیدت کے آنسوؤں سے اسے خراج تحسین پیش کر رہے تھے

وہ خوب صورت جوان کون تھا، مسٹر سٹیفن مسٹر جیمز یا لیلا جیمز نی لیلا سٹیفن کا بیٹا۔ وہ تینوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ مگر کون ؟ کون تھا وہ آدمی، وہ نوجوان جس کے کوٹ کا کفن پہن کر وہ پاکیزہ ہستی اپنا راز اپنے ہی ساتھ لے کر آدمیوں کی اس نشتر دنیا سے چل دی تھی۔

بمبئی

سر کو زانوؤں میں دبائے وہ جانے کب سے چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر ادھر دیکھتا تو اسے بڑا عجیب سا لگتا۔

یہ بمبئی بھی کیسی دل فریب نگری ہے ——— ہر وقت ناچتی گاتی رہتی ہے ——— کیسی انوکھی ادا سے اس کا انگ انگ روشنیوں کا لباس اوڑھے پانی کی سطح پر تھرک رہا ہے۔

دھرتی کی غمزدہ کوکھ میں گڑھی ہر عمارت دیار کے درخت کی مانند زمین میں کم اور آسمان میں زیادہ ہے۔ گویا اس کا رشتہ زمین کی نسبت آسمان سے زیادہ قریبی ہو ———

چرچ گیٹ اسٹیشن کی طرف لپکتی یا اس کے پہلو سے چھوٹتی ہر برقی گاڑی بندوق کی گولی کی مانند دندناتی گزرتی ہے۔

دس بجے کا سائرن ختم ہوا تو اسے لگا گویا شہر ایکا ایک بوڑھا ہو گیا ہے اور یہ سائرن ایک چیخ ہے۔

چند لمحے پہلے ان عمارات کا سینہ تانے سوئے فلک دیکھنا اسے بڑا پر اعتماد لگا تھا۔ اب یہی عمارتیں اسے سہمی سہمی فکرمند اور حسرت بھری نگاہوں سے خدا کے حضور میں رحم کی طلب گار لگ رہی تھیں۔

کیسی عجیب و غریب جگہ ہے۔ اسے تعجب تھا کہ آج وہ یہاں کیوں ہے، وہاں کیوں نہیں جہاں اسے ہونا چاہیئے تھا!

رہٹ

رہٹ چل رہا تھا۔ چھوٹی بڑی مستی سے ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لیتی اور چھینٹے اُڑا اُڑا کر نہاتی جا رہی تھی آج وہ بہت خوش تھی۔

بڑی پانی کے اِس چھوٹے سے حوض کے کنارے بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ چھوٹی نے یکایک خفا ہو کر کہا۔ "ہر روز وہی کپڑے، وہی فراک، وہی چڈھی"۔

کپڑے کم بھلے ہی ہوں مگر صاف ستھرے تو ہونے چاہیے۔ تو جو ہر روز نہاتی ہے اور ہر روز اِسی طرح مل مل کر نہاتی ہے، کیوں؟۔

واہ دیدی کیا سوال پوچھا ہے تم نے؟

سوال کیا ہے میں نے، جواب دو۔

"پہلی بات تو یہ ہے دیدی کہ اِس طرح اِس کھلی فضا میں اور اِتنے ڈھیر سے پانی میں نہانے سے بڑا مزہ آتا ہے۔ رہی مل مل کر نہانے کی بات تو اس کا جواب یہ ہے کہ بدن پر چپکی ہوئی دِن بھر کی گرد، میل سب دُھل جاتی ہے اور جسم کھِل جاتا ہے، گلاب کے پھول کی طرح"۔

"ایک ہی بدن ہے اور وہ بھی اِتنا چھوٹا سا۔ اِسی کو روز روز دھوتی ہو، کیوں؟"

چھوٹی لاجواب ہو کر، ہنسنے اور زور زور سے ڈبکیاں لگانے اور پانی کے چھینٹے اُڑانے لگی۔ کچھ دیر بعد چھوٹی نے دوسرا سوال کیا۔ "یہ بڑے بھیّا روز روز جھگڑتے ہیں

اسے کہاں ہونا چاہیئے تھا؟

سوالات ہی سوالات تھے، اور وہ حیران و پریشان ـــــ سمندر کی وشال چھاتی پر پھیلی اپنی ہی طرح مغموم و اداس تاروں کی مدھم ضیا میں وہ ان سوالوں کے جواب تلاش کر رہا تھا۔ سوال ہی سوال تھے جن کو لے کر وہ آج صبح ہی سے اس قدر حیران و ششدر گھوم رہا تھا ـــــ اس کی زندگی کتنی محدود تھی اور سامنے پھیلا سمندر کتنا وسیع۔ اسی کیفیت میں کھوئے کھوئے نہ جانے کتنی دیر سے بت کی طرح چپ چاپ بیٹھا تھا۔ آخر اس کے سوکھے ہونٹ تھوڑا تھوڑا ہلنا، کھلنا شروع ہوئے۔ غالباً اس خوف سے کہ اگر وہ اسی طرح جمے رہے تو شاید ہمیشہ کے لئے سل جائیں وہ خود سے ہم کلام تھا مگر مکالموں میں آواز نہ تھی۔ جس جذبہ کے تحت وہ آج اپنے تھکے ہارے، بیمار وجود کو سمندر کے اس کنارے تک گھسیٹ لایا تھا وہ آدمی کی قوت گویائی کہاں بچی رہنے دیتا ہے۔ جب تک موت کا خوف رہتا ہے مکالمے بے آواز رہتے ہیں۔

خوف جاتا رہے، آدمی موت سے لاپرواہ اور بے نیاز ہو جائے تو مکالموں میں آواز اپنے آپ لوٹ آتی ہے

خوف ہیجخ تو بن سکتا ہے گرہ دار، واضح اور صاف لفظ لفظ حرف حرف بن کر ظاہر نہیں ہوتا۔

میں کون ہوں۔ کیوں ہوں۔ یہ سب کیا ہے۔ کس کے حکم سے ہے۔ کہاں میری یہ تنہائی، مختصر، سکڑی، حقیر و بے کار زندگی، اور کہاں یہ بے پایاں۔ یہ دائمی غیر فانی، سرمدی وسعت ـــــ

تو کیا ہے؟

تو کچھ بھی نہیں ہے پیارے ـــ بس ایک لہر ہے جو حوصلہ کر کے اٹھتی ہے۔ بڑھتی ہے اور پھر ہار کر تھک کر اپنے آپ میں ہی مرکھپ کر سمٹ جاتی ہے۔

"میں ایک وقفہ ہوں ـــ حیات جاوداں کا ایک ناچیز، حقیر وقفہ ایک لمحہ ـــ ان گنت لمحات سے بنی اس بقائے دوام، اس لامتناہیت، اس عمیق لامحدودیت میں میرا کیا مقام ہے۔ یہ مجھ سے پہلے بھی تھی۔ میرے بعد بھی رہے گی۔

میری حیثیت پانی کے اس بے پایاں ذخیرے میں ایک معمولی بلبلے سے بھی کم ہے

ہر تو دور کی بات ہے ـــــ لہر لڑنا تو جانتی ہے ۔ مر مٹنے سے پہلے ایک نعرہٴ احتجاج تو بلند کرتی ہے ـــــ"

"یہ سرمدیت ۔ میں اسے نہیں جانتا ۔ یہ مجھے نہیں جانتی ۔"

"جسے میں جانتا نہیں ، سمجھتا نہیں ، جو مجھے نہیں جانتی ۔ جاننا چاہتی بھی نہیں اس سے کیا لگاؤ ۔ کیسا لگاؤ ۔ کیسا موہ ۔ "

"اس بھری لدی بمبئی میں یہ اجنبیت کیا مجھے ہی محسوس ہو رہی ہے ـــــ یہاں ادھر وطن عزیز سے اتنی دور ، تو کیا کرنے آیا تھا ذلیل کتے ـــــ"

"نہیں نہیں گالی مت دو میں آدمی کی اولاد ہوں ۔ کتّا ہوتا تو سڑکوں پر بکھرے ہوئے روٹی کے ٹکڑے نگل کر بھی جی سکتا تھا ـــــ "

میری مصیبت یہی تو ہے کہ میں بے گھر اور بے نوا ہوتے ہوئے بھی خوددار ہوں ـــــ

"خودی کو کر بلند اتنا" ہوں ! ۔ "

شاعری بھرے پیٹ کا ڈکار ہے ـــــ

میری خودی بھلے ہی اتنی بلند نہیں کہ خدا کو میری تقدیر ، میری حسب منشا لکھنے پر مجبور کر دیتی ، مگر میں خوددار ضرور ہوں ۔ ایسا نہ ہوتا تو میں بھی مانگ کر کھا سکتا تھا ۔

بھیک مانگنا میرے ملک میں کبھی معیوب نہیں سمجھا گیا ۔ مگر میں بھکاری نہیں ہوں ۔

میری مصیبت یہی ہے کہ اس محرومی ، اس مجبوری و لاچاری کے باوجود میں بھکاری نہیں ہوں

تیری یہ حالت حکمِ ربیّ ہے ۔ خدا کی مرضی ۔ اُس کی رضا ۔ اس دنیا میں اُسی کا اقتدار چلتا ہے ۔ جو ہے ۔ جیسا ہے ۔ اُسی کے دم سے ہے ۔ اُس سے مانگنا ہر کسی کا حق ہے ـــــ

جھوٹ سفید جھوٹ ـــــ

کیسے گڑگڑا کر کتنی بار ۔ کتنا کم مانگا تھا ۔ مگر اس نے نہیں دیا ۔ کچھ بھی تو نہیں دیا ۔ جبھی تو بھاگنا پڑا ۔ گھر بار چھوڑ کر ـــــ

بوڑھی بیوہ ماں ، چھوٹے بہن بھائی کی بھوک دیکھ سکتا تو انھیں کے ساتھ مرتا ۔ مرنے کے لیے اِتنی دور کیوں آتا ـــــ

آدمی کو اس کا نوالہ گھاٹوں گھاٹ لیے پھرتا ہے ۔ دانہ ، پانی ۔ جہاں کی مٹی ہے ۔ وہیں

تو لگے گی۔

مرنا ہی تھا کمبخت تو اپنے ہی گھر کیوں نہ مرا۔

وہاں مرتا تو لاش کی بے حرمتی نہ ہوتی؟ کون کرتا تیرا واہ سنکار؟ یہاں تجھے کوئی جلائے گا نہ دفن کرے گا۔

اسے یاد آرہا تھا اپنے محبوب شاعر کا وہ شعر جس میں اس نے دریا میں غرق ہونے کی تمنا کی تھی تاکہ نہ کوئی اس کا جنازہ اٹھائے، نہ کہیں اس کا مزار ہی بنے ——

لوگ بڑے بڑے کام کرتے ہیں تاکہ مرنے کے بعد ان کی یاد قائم رہے اور ان کے مزاروں پر لوگ عقیدت کے پھول چڑھائیں ——

بڑے احمق ہوتے ہیں یہ لوگ ——

مرنے میں کیا نیا پن ہے —— ہر کوئی مرتا ہے ——

مگر ایسے ——

اس عمر میں ——

بھوکے پیاسے مرنا —— یہ بھی کوئی مرنا ہے ——

اس نے نیچے جھک کر چلّو بھر پانی لیا اور پینے کے ارادہ سے اسے ہونٹوں تک لے گیا۔ پانی کھاری تھا، مگر اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ وہ بھوکا تھا۔ ضرورت پانی سے زیادہ روٹی کی تھی۔ اس نے جیب ٹٹولی۔ چنے کے دو چار دانے، بھنی ہوئی مونگ پھلی، ایک مچلا ہوا سگریٹ —— سگریٹ کا ہاتھ میں آنا تھا کہ اس کا دوسرا ہاتھ، اور قطعی لاشعوری انداز میں یکے بعد دیگرے کوٹ پینٹ اور قمیص کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

دیا سلائی کی ڈبیا تو تھی مگر خالی۔ ہت تیرے کی۔ وہ اسے پھینکنے ہی لگا تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ ڈبیا کھولی تو دیکھا کہ ایک اکلوتی سلائی ڈبیا کے اندر ایک کنارے سمٹی پڑی ہے۔

بیچاری اکیلی ہے۔ میری طرح۔ اسی لیے تو اس طرح یوں سہمی بیٹھی ہے

اس نے مونگ پھلی کی ایک پھانک کو چھیلا۔ اس آدھی ادھوری مردہ سی پھانک میں بھی ایک بھرپور کُرمُرا دانہ چھپا بیٹھا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ دانے کو سمندر میں پھینک

دے۔ مگر مرنے سے پہلے کچھ تو کھا ہی لینا چاہیئے۔ اوبر اس کے گھر جا کر کہیں یہ سوال نہ اٹھے کہ ہم نے تیرے لیے خوراک کا یہ دانا رکھا تھا تو کس طرح الزام دھرتا ہے کہ پروردگار نے تجھے بھوکا مارا ـــــ دانہ اس نے منہ میں ڈال لیا۔ بڑا انوکھا ذائقہ تھا اس ایک دانے کا۔ بھنے ہوئے چنوں کے دانے بھی اس نے ایک کے بعد ایک نگل لیے۔

وہ اب بھی بھوکا تھا، گو پہلے جتنا نہیں۔

آدمی کی ضرورت کتنی کم ہوتی ہے ـــــ

اس نے پھر جھک کر سمندر کا پانی چلو میں بھرا اور بغیر سوچے سمجھے پی لیا۔ جو بھی اثر ہو اس کا ہے تو پانی ہی ـــــ

بڑی احتیاط سے اس نے دیا سلائی جلا کر اپنے آخری ادھ مچلے سگریٹ کو بڑے اہتمام سے سیدھا کر کے سُلگایا اور دھویں سے جسم کے ہر خالی حصے کو بھر لیا۔ جب تک دم گھٹنے کی نوبت نہیں آگئی اس نے دھواں خارج نہیں کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ سگریٹ کے ایک ہی کش نے اس کی اداسی اور اکیلا پن کافی حد تک دور کر دیا ہے۔ اب پہلی بار اس نے گردن گھما کر اپنے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔

چھ سات فٹ چوڑی یہ فصیل نما سڑک سمندر میں خاصی دور تک چلی گئی تھی۔ سمندر کے اس حصہ کو ری کلیم کرنے کی غرض سے ہی کبھی اسے بنوایا گیا تھا۔ پھر جنگ یا کسی دوسری ایسی ہی اہم وجہ سے یہ کام ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھ سات فٹ کی چوڑائی خاصی ہوتی ہے، مگر چونکہ اس کے دیوار کے دونوں اطراف سمندر تھا اور کناروں پر کوئی حفاظتی جنگلا وغیرہ بھی نہ تھا، لہٰذا عام لوگ اندھیرے میں ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔

وہ کیوں نہ ڈرا تھا۔ بڑا بہادر تھا نا؟

موت سر پر منڈلا رہی ہو بلکہ یقینی ہو تو دوسرے تمام جذبوں کے ساتھ ساتھ خوف و دہشت کے جذبات بھی کند پڑ جاتے ہیں ـــــ

وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ مسکرا رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔ بیس برس کا ہونہار ذہین نوجوان، مفلسی اور ناداری کے باوجود جوانی کی امنگوں سے سرشار۔ کیسی مضحکہ خیز ہے پروردگار کی یہ دنیا۔

سالا جوکر ہے ـــــ ڈاکٹر کار کہا کرتا تھا ـــــ

ڈاکٹر کار ـــــ اس کا انگریزی ادبیات کا فاضل معلّم ـــــ

ـــــ سالا جوکر ہے۔ ایک آدمی کو لکھ پتی بنا دے گا اور اس کی بھوک چھین لے گا۔ نیند چھین لے گا۔ ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی کر دے گا۔ ایک آنکھ ناکارہ کر دے گا ـــ دوسرے کو یونانی فرشتوں ایسا جسم عطا کر کے سڑکوں پر روڑی تڑوانے کے لیے پھینک دے گا۔ بھوک دے گا پیسہ نہیں دے گا ـــــ راجہ کا دل دے گا اور فقیر کی تقدیر ـــــ سالا بڑا حرامی ہے ـــــ

جوکر ـــــ حرامی ـــــ یہ گالیاں نہ تھیں ایک دانشور کے گلے تھے، اپنے طرفہ خالق سے۔ رات بھیگ چلی ہے، اب لوٹنا چاہیئے۔ مگر کہاں۔ میں تو ادھر مرنے، مر جانے کے ارادے سے آیا تھا ـــــ میرا وقت آگیا ہے ـــــ

اس نے بوٹ اتار کر پاؤں پانی میں ڈالے۔ جون کی بھرپور گرمی کے باوجود سمندر کا پانی خاصا ٹھنڈا تھا ـــــ

ٹھنڈی قبر ـــــ

کل کسی اخبار کے کسی کونے میں چھپی ہوگی یہ خبر ـــــ

"آج صبح "ن" پوائنٹ کے قریب سمندر کی سطح پر تیرتی ہوئی ایک نوجوان کی لاش ملی۔ مرحوم کا نام پتہ کچھ معلوم نہیں۔ خودکشی کی وجہ غالباً عشق میں ناکامی تھی۔ مرنے والا بڑا ہی وجیہہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کون سی ظالم حسینہ ہوگی جس نے ایسے خوب صورت نوجوان کا دل توڑ کر اسے خودکشی پر مجبور کر دیا ـــــ"

وہ مسکرایا۔ اپنی موت کی کہانی کی خبر کا عنوان "ٹھنڈی قبر" اسے پسند آیا ـــــ

وہ اپنے آبائی قصبہ سے چلا تھا تو اس کا خیال تھا کہ بمبئی اسے خوش آمدید کہے گی، اور استقبال کے لیے خود اسٹیشن پر حاضر ہوگی۔

مگر بمبئی کوئی ایک واحد فرد یا کردار تو نہ تھی۔ بمبئی تو ایک ہجوم تھی۔ ایک دنیا۔ طویل و عریض اور بے مروت۔ بگڑی تقدیروں سے بے نیاز، صرف اچھے خوش گوار مقدروں کی ناز بردار ـــــ

تیری مردہ پھولی ہوئی لاش کا یوں پائے جانا کیا مناسب ہو گا۔ تو تیر سکتا تو دور سمندر کی گہرائیوں میں پہنچ کر ڈوبتا۔ مگر تب بھی کیا ہوتا۔ اسے جوہو پر ناریل کا پانی بیچنے والے کی بات یاد آگئی ــــــــ

اس نے پوچھا تھا "کچھ پیو گے جناب ؟"

کیا پلاؤ گے یار۔ تمہارے پاس لے دے کے یہ ناریل کا پانی ہی تو ہے۔

آپ کو کیا چاہیئے صاحب ؟

بیئر !

وہ بھی ملے گا صاحب اور وہ سچ مچ ہی بیئر لے آیا تھا۔

وہ سمندر میں کچھ دور گیا تھا پھر اس نے پاؤں کے نیچے بھی ساحل کی ریت کو ٹٹولا تھا اور جھک کر بیئر کی ٹھنڈی تخ دو بوتلیں نکال لی تھیں ــــ خالی ہو جانے پر اس نے دونوں بوتلیں دوبارہ سمندر میں پھینک دی تھیں، زور سے گھما کر ــــــ

"کیوں میاں خالی بوتلیں تو بکتی ہیں، یوں بلا وجہ کیوں پھینک دیں ؟"

"پھینکی کہاں ہیں صاحب۔ راجہ کو سنبھالی ہیں، بتیسی نکال کر اس ناریل بیچنے والے نے سمجھایا تھا ــــ"

سمندر تو اپنا راجہ ہے صاحب۔ وہ ہم کنگلوں کا کبھی کچھ نہیں لیتا۔ بڑا دان ویر راجہ ہے جناب، یہ سمندر۔ وہ بوتلیں ادھر ہی رہیں گی۔ جب موج آئے گی راجہ کو اچھالی آئے گی اور بوتلیں باہر ــــــ

ابھی اس نے فقرہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ ایک زبردست اچھالی آئی اور درجنوں بیئر کی بوتلیں ریت پر چھوڑ کر لوٹ گئی۔

دیکھی آپ نے ہمارے نٹ کھٹ راجہ کی ترنگ۔ میں نے بڑی مشکل سے پانچ چھ بوتلیں بیچی ہیں آج اور یہ دگنی کر کے لوٹا رہا ہے۔ شکر ہے یہاں کوئی پولس والا نہیں، نہیں تو دھر لیتا ــــــ

بڑی مزے دار کہانی تھی ناریل کا پانی بیچنے والے اس غریب سوداگر کی ــــــ

جو کنگلوں کا کچھ نہیں لیتا، ظاہر ہے کہ تیرے ایسے کنگال ہی کو کیوں لے گا اپنی

گود میں

۔۔۔ایسے نہیں چلے گا۔۔۔۔۔

کچھ سوچ کراس نے آس پاس سے چھوٹے بڑے پتھر کنکر اٹھا اٹھا کر جیبیں بھرنی شروع کریں پھراس نے بوٹ پہنے اور وطن عزیز کے سب سے امیر اور دولت مند شہر کی جانب آخری حسرت بھری نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ پانی میں اترنے لگا۔

"یہ بیکار ہے۔قطعی بیکار۔۔۔

یہ آواز کہاں سے آئی تھی ۔۔۔۔ اس نے ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھانکا مگر اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔۔۔ پھر آواز آئی ۔۔۔۔ "تمہیں ناحق سردی زکام ہو جائے گا۔ شدید قسم کا بخار بھی ہو سکتا ہے ۔۔۔ علاوہ ازیں خودکشی ایک جرم ہے۔ پکڑے جانے پر سزا بھی مل سکتی ہے ۔۔۔۔۔"

پوائنٹ کے آخری سرے سے ذرا ہٹ کر نسبتاً ذرا نچلی سطح پر ایک پتھر کے اوپر لیٹنے سے اٹھنے کی حالت میں آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے ایک سائے کو اس نے ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ تم تیرنا نہیں جانتے اسی سے مرنا بھی نہیں جانتے۔ یہاں پانی اتنا گہرا نہیں کہ تم ڈوب سکو۔ سمندر کی کوئی شریر لہر تمہاری کچھ مدد کر سکتی تھی۔ مگر اب وہ بھی کچھ نہیں کر سکتی کیوں کہ میں ایک نامی تیراک ہوں۔ اپنے ساتھ میرے کپڑے بھی بھگوؤ گے۔ جو ظاہر ہے کہ مناسب نہیں ۔۔۔۔

اجنبی اب اس کے بالمقابل آکر بیٹھ گیا تھا ۔۔۔۔۔۔

"سگریٹ پیو گے؟۔"

تم کون ہو؟

سوال مت کرو۔ یہ لو سگریٹ پیو۔ ڈبلیو ڈی ایچ اور ولز کے سگریٹ۔ میں ان پر جان دیتا ہوں ۔۔۔ اور لو یہ کھا جا بھی لو۔ کافی ہے میری جیب میں۔ میں کاجو کے کھیتوں کا کسان ہوں۔"

تم کون ہو؟

پھر وہی سوال ؟ جاننا ہی چاہتے ہو تو سمجھ لو کہ میں بمبئی ہوں ـــــ تم غالباً پنجاب کا کوئی چھوٹا موٹا قصبہ ہو۔ میں کبھی خود ایک معصوم گاؤں تھا، مگر اب میں بمبئی ہو گیا ہوں ـــ بمبئی ہوئے بغیر بمبئی میں جینا ممکن نہیں۔ تم ابھی بمبئی کو نہیں جانتے۔ جانتے ہوتے تو یوں اس طرح نامردوں کی طرح یہاں اس فضول جگہ پر جان دینے نہیں آتے۔ بمبئی کے لوگ مرتے نہیں دوسروں کو مارتے ہیں۔ یا مارے جاتے ہیں۔ یہ مقدروں کے سوداگروں کی آماجگاہ ہے ـــ۔"

"میں ـــــ میں ـــــ"

"تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تم کیوں آئے ہو یہاں یہ سوال میں تم سے نہیں پوچھوں گا کیوں کہ میں بھی تمہاری ہی طرح کچھ تمہارے ہی ایسے مقصد کو لے کر تقدیر آزمانے یہاں آیا تھا ـــــ تم جیسوں کو تو میں ایک نظر دیکھ کر ہی لفافے میں لکھی ساری عبارت پڑھ لیتا ہوں۔ تم بھیڑ میں بھی ہو تو میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں ـــــ تم پنجاب کے کسی گاؤں یا چھوٹے موٹے قصبے سے ہو۔ پنجابی الھڑپن تمہارے جسم کے ہر خم، ہر ادا سے پھوٹا پڑتا ہے۔ میں دوپہر سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوں۔ پرسوں تم نے سو روپے کی اپنی خاندانی گھڑی تیرہ روپے میں بیچ دی تھی۔ اور سیدھے پوسٹ آفس گئے تھے۔ جہاں تم نے دس روپے کا منی آرڈر کرایا تھا میں نے تبھی اندازہ کر لیا تھا کہ باقی کے دو تین روپوں سے تم زیادہ سے زیادہ دو دن اور لڑ سکتے تھے اس ناشناس زندگی سے ـــــ اس شہر کی سماج بڑی دل توڑ اور لاپرواہ ہے، مگر میں اس شہر کا ہوتے ہوئے اور اس کی رگ رگ کی شناخت سمجھتے ہوئے بھی دل سے وہی کاجوؤں والا دیہاتی ہوں جو عرصہ ہوا تمہاری ہی طرح یہاں وارد ہوا تھا۔

تمہیں ایک نظر دیکھ کر ہی میں نے تمہاری ہمت کا اندازہ کر لیا تھا اور جان گیا تھا کہ تم زندگی سے بہت جلد تھک جاؤ گے، اکتا جاؤ گے اور پھر خودکشی کی کوشش کرو گے جو میں تمہیں کرنے نہیں دوں گا۔"

کیوں ؟"

کیوں کہ مجھے خودکشی سے بے حد نفرت ہے۔ آدمی کو اس قدر خودمختار ہونے کا حق نہیں ہے۔"

تم ـــــ مجھے ـــــ مرے حالات ـــــ تم کچھ بھی تو نہیں جانتے میرے بارے

میں ——————

"تم تقدیر کے مارے ہوئے ہو۔ ادھر گھر میں بھی خاصی تنگی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو تم گھر سے پیسے منگوانے کی بجائے گھڑی بیچ کر وہاں پیسے نہ بھجواتے —— اور کیا جاننا باقی ہے

"تم آج تو مجھے بچا کر لے جاؤ گے، مگر کل ——"

آج کی رات ہی تمہیں اتنا سخت جان بنا دے گی کہ تم اس کے بعد خودکشی کو خودمختاری نہیں خودغرضی بلکہ بزدلی سمجھو گے۔ میرا تجربہ ہے کہ موت کے دروازے سے لوٹا ہوا آدمی دوبارہ خود کبھی ادھر رخ نہیں کرتا

تمہاری یہ واپسی تمہیں بمبئی کے بے مروت ہجوم کا ایک کردار بنا دے گی۔ اب کے بعد تم مرو گے تو، مگر کب اور کیسے یہ وہی اوپر والا ہی جان سکے گا۔ تمہیں مجھے یہ سب جاننے کی مزید ضرورت بھی نہ رہے گی۔

"تم ہو کون؟"

"کہا نا، کہ میں بمبئی ہوں"

یہ تو کوئی نام نہ ہوا۔

تم بمبئی کو نام نہیں سمجھتے۔

یہ ایک شہر کا نام ہے۔

یہاں کا ہر فرد ایک شہر ہے۔ بمبئی ہے۔

تم رہتے کہاں ہو۔

تم سمجھ دار ہوتے جا رہے ہو ——

آؤ اب کسی قریبی ایرانی ہوٹل سے کچھ کھا پی لیتے ہیں۔ پھر کل مل کر مستقبل کے منصوبے طے کریں گے۔

دونوں اٹھ کر آبادی کی طرف چل پڑے۔ ایکا ایک بمبئی نے پوچھا

تم نے محبت کی ہے؟

وہ چپ رہا

تم ایک بے حد دلکش شخصیت کے مالک ہو۔ ہر خوب صورت آدمی محبت کرنا اپنا

حق سمجھتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ تم نے محبت نہ کی ہو۔

وہ پھر چپ رہا۔

میں تمہاری طرح خوب صورت آدمی نہیں ہوں مگر محبت ایک بار میں نے بھی کی تھی۔ اپنی بھونڈی صورت اور اس کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر محبت کا اظہار البتہ میں کبھی نہ کر سکا۔ مگر امید ہمیشہ یہی رکھی کہ وہ میرے دل کا بھید جانتی ہے۔ وہ چند لمحے جو اسے دور ہی سے دیکھنے میں گزرے تھے آج تک میرے کام آرہے ہیں۔ زندگی کے کتنے ہی سال میں نے ان لمحات کی یاد کے سہارے گزار دیئے ہیں۔ وہ چلی گئی کسی دوسرے کی ہو گئی۔ مگر میں نے آج تک کبھی نہیں سوچا کہ وہ اب نہیں ہے۔ میں اسے ایک خوشبو بنا کر اپنے وجود میں جذب کیے ہوئے ہوں جبھی تو پھر کبھی اس سے ملنے یا اسے دور ہی سے ایک نظر دیکھ لینے بھر کی خواہش بھی میں نے کبھی نہیں کی۔ آج تک اسی نشے کا خمار بنا ہوا ہے، رنج کیا ہے۔ خوشی کیا ہے۔ بیتے لمحوں کی یاد ہی تو سب کچھ ہے۔ محبوب بندگی میں نہیں عاشقی میں ملتا ہے۔ عاشقی اب میری زندگی ہے۔ ارے بھئی تم بھی تو کچھ سناؤ۔

کیا سناؤں میرے محترم دوست۔

اپنی کہانی۔ میرا یقین ہے کہ تم بھی ایک کہانی ہو

وہ الفاظ کہاں ہیں جو ساتھ دیں اور میں تمہیں بتا سکوں کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ میں وہ صحرا نورد ہوں میرے بھائی جو چشمے کے کنارے پہنچ کر بھی پیاسا ہی رہا ہے ——

زندگی کے ناز اٹھانا سیکھو میرے نوجوان دوست

لفظ دوست اسے بڑا اچھا لگا۔ ایک انوکھی مہک تھی اس لفظ میں جو اسے سرشار کر گئی۔ مگر جواب میں وہ اتنا ہی کہہ پایا —— اتنی سکت اب مجھ میں کہاں ہے اے دوست،

محبت وہ نشہ ہے پیارے جو گراوٹ میں بھی حوصلوں کو ابھارتا ہے۔ بس تھوڑا صبر، تھوڑا ضبط ——

رسمی الفاظ ہیں

مانتا ہوں دوست۔ مگر یہ درد بھی ایک دولت ہے۔ دیکھتا ہوں تم اس دولت

پتاجی سے "یہ میری زندگی ہے۔ اِسے میں اپنے طور سے جینا چاہتا ہوں۔" دیدی یہ زندگی کیا بلا ہے؟۔

بڑی نے سمجھایا۔ پچھلی سال لالی کی جڑواں بہن شانو مرگئی تھی نا! جب تک وہ جیتی تھی زندہ تھی۔ زندہ رہنا زندگی ہے اور مرجانا موت۔

لالی کی بچّی کیا شان سے شانو دیدی کے کپڑے پہنے پھرتی ہے! اُن کی ساری فراکیں ایک کے بعد ایک ہر روز نئی فراک، ہر روز نئی پوشاک، مجھے تو رشک آتا ہے لالی کے نصیب پر۔

کچھ دیر کے لیے دونوں بہنیں چپ ہوگئیں۔ پھر کچھ سوچ کر چھوٹی نے کہا۔ "جب تو مرجائے گی نا، دیدی! تو میں بھی تیرے سارے کپڑے لے لوں گی۔"

بڑی مُسکرائی۔ "تجھے کیسے معلوم کہ پہلے میں ہی مروں گی، تو بھی تو مرسکتی ہے۔"

بات بڑی تھی چھوٹی کی سمجھ میں نہ آئی۔ بولی وہ کیسے؟

تو ہی بتا، تُو نے کیسے جان لیا کہ پہلے میں ہی مروں گی۔

چھوٹی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ "تو بڑی ہے نا۔ پہلے ہماری نانی مری تھی نا! نانی جو اماں سے بڑی تھی۔ اماں بھی مرگئی مگر بعد میں ہی تو!!

اچھا اِس رہٹ کو دیکھو اور بتاؤ کہ کون سا ڈول پہلا ہے، کون سا دوسرا، اور کون سا تیسرا اور کون سا آخری۔

چھوٹی، چھوٹی ضرور تھی مگر تھی ہوشیار، خاص کر ریاضی میں۔ مُسکرا کر بولی۔ "ہر ڈول پہلا بھی ہے اور دوسرا بھی تیسرا بھی اور آخری بھی۔"

کہنے کو تو وہ کہہ گئی مگر جلد ہی بڑی کی بات کا مفہوم سمجھ کر اُداس ہوگئی۔ "ہم لوگ بھی اس رہٹ کے ڈولوں کی طرح ہی ہیں نا دیدی؟"

بڑی نے بڑے پیار سے چھوٹی کے گال پر تھپکی دی اُس کا دل بھی بھر آیا تھا۔

سے مالا مال ہو۔ درد دل بڑی پیاری شے ہے میری جان۔ برے وقتوں میں اپنا دل ہی کام آتا ہے دل کے سامنے سر تسلیم خم ہونا سیکھو۔

میں تھک گیا ہوں۔ زندگی کی تیز و تند ہواؤں کے بالمقابل چراغِ الفت جلائے رکھنا میرے بس میں نہیں ہے۔ خزاؤں میں بھی دل کی رعنائیاں برقرار رکھنا تمہارے بس میں تو ہو سکتا ہے، کیوں کہ تم فولاد کے آدمی ہو۔ میرے لیے تو انسانیت کی روشنی جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گئی ہے ——— آج کوئی بھی آدمی مجھے ایک وجودِ واحد نہ ہو کر نیا سایا سا لگتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں زندگی کا بوجھ کیوں بنوں ———

آدمی زندگی کا بوجھ نہیں۔ سہارا ہوتا ہے۔ امید، یقین، زندہ رہنے کے یہی تو بہانے ہیں پیارے

لطف دوزخ بھی ، لطفِ جنت بھی
ہائے کیا چیز ہے ، محبت بھی

محبت ، محبت۔ ملن کے گیت ادھورے ہوتے ہیں جبھی ان کی کسک دلوں کو بھاتی ہے، اچھی لگتی ہے۔ دنیا کے ان اندھے اندھیروں میں جنم جنم کی رفاقتیں چھوٹ جاتی ہیں، سب کچھ کھو جاتا ہے جو کھو گیا، کھو گیا۔ اب ———

کہو، کہو، رک کیوں گئے۔"

"مجھے یہ موضوع قطعی پسند نہیں۔"

دونوں چپ ہو گئے

وہ سوچ رہا تھا۔

تو کتنا ظالم ہے۔ کیسے اسے روتے بلکتے چھوڑ آیا تھا۔ بیچاری معصوم لڑکی کا شگفتہ گلاب ایسا چہرہ کیسے ایک دم مرجھا گیا تھا۔ نبھانے کے حوصلے نہیں تھے۔ کمبخت تو تو نے اس کچی کونپل کو چھیڑا ہی کیوں۔ پھر جب تو نے اسے شاخ سے توڑ ہی لیا تھا تو گود میں کیوں نہ بھر لیا۔ خاک میں مسلی جانے کے لیے کیوں چھوڑ دیا۔ کون جانے اس پر کیا گزری ہو گی۔ سمندر کی خنک ہوا کی کانپتی تھرتھراتی کمپن نے اسے چونکا دیا۔ اسے لگا بمبئی والا اس کی کہانی جان گیا ہے، مگر وہ تو اپنی ہی دھن میں کھویا کھویا چل رہا تھا۔

وہ زندگی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اب وہ سب یاد کرنے سے فائدہ ـــــ وہ جنوں، وہ دیوانگی اچھل کر ستاروں کی چھو لینے کی وہ طفلانہ امنگ وہ الھڑ تمنا۔ بھلا ہی دینی چاہیئے۔ وہ کہانی جو اب ایک پرانی شکستہ کتاب ہے جس کا ورق ورق بوسیدہ اور ناکارہ ہو چکا ہے کیا بھلانا ہے کیا یاد رکھنا ہے یہ شعور بھی تو اب مجھ میں نہیں ہے۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ چلی گئی۔ وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھتی تو میں اسے روک لیتا ـــــ میں نے ہی کیوں لپک کر اس کا پلو نہ پکڑ لیا ـــــ وہ میرے لیے دونوں جہان چھوڑنے کو تیار تھی۔ میں ہی دامن چھڑا کر چلا آیا ـــــ میرا درد تو آج ہی میرے ساتھ ختم ہو جاتا مگر جو زخم میں اسے دے آیا ہوں اسے کون بھرے گا ـــــ زمانہ ـــــ وقت۔ وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے وہ بھی یقیناً مجھے بھلا چکی ہو گی ـــــ

یہ آخری خیال اسے اچھا نہ لگا ـــــ ایکا ایک وہ بلند آواز سے چلایا "مگر اب کیا فرق پڑتا ہے"

تم ٹھیک کہتے ہو بمبئی والا بولا۔ واقعی اب کیا فرق پڑتا ہے۔ چلو چائے لیتے ہیں تم نے کچھ کھایا بھی تو نہیں۔ میں اسی سامنے والے ایرانی ہوٹل میں کھایا پیا کرتا ہوں

دوسرے روز وہ بمبئی والے کی ہدایت کے مطابق کچھ کاغذ اور قلم لے کر جی پی او پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا پچھلی رات کا ساتھی سیڑھیوں میں چند غریب و مسکین قسم کے مزدوروں کے درمیان بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی بمبئی والا چلایا ـــــ لو وہ آگیا ہے ـــــ میں اسی کی بات کر رہا تھا

یہ انگریزی بھی جانتا ہے، اردو، ہندی اور گورمکھی بھی۔ نوکری کے لیے عرضیاں اور بیویوں اور محبوباؤں کے لیے خط اس سے لکھواؤ اور ماں باپ وغیرہ کے لیے رسمی خطوط مجھ سے۔

اس روز وہ تقریباً سارا دن لوگوں کی عرضیاں اور خطوط لکھتا رہا۔ شام کو بمبئی والے نے پوچھا "کیا کمایا؟"

سات روپے!

یہ ہوئی نہ بات ـــــ

اب لاؤ میرا روپیہ

یہ لو۔

یہ ہوئی نہ بات _____

آؤ آج پنجابی ڈھابے سے شدھ گھی سے تڑکی ہوئی اڑد کی دال اور گیہوں کی روٹی کھا کر سنیما دیکھنے جائیں گے۔

وہ بھی مسکرا دیا۔

یہ ہوئی نہ بات

ماضی کی دُھند میں لپٹی اِک یاد

سڑک پر تین ہوٹل تھے۔ پنجاب خالصہ، شیرِ پنجاب اور رام رحیم کا ڈھابہ۔ پہلے دو کو پنجابی سکھ اور تیسرے کو رام رحیم خود چلاتے تھے۔

تینوں ہوٹلوں پر خدا کی مہر تھی۔ کھانے کے اوقات میں تینوں پر کافی بھیڑ جمع رہتی۔ ان میں فرق صرف اتنا تھا کہ شیرِ پنجاب میں کھانے والے کھاتے پیتے لوگ ہوتے تھے۔ پنجاب خالصہ میں درمیانہ درجہ کے نوکری پیشہ لوگ اور رام رحیم کے ڈھابہ میں رام رحیم ہی کے بندے۔

اس ڈھابہ میں ایک طرف گوشت روٹی کا انتظام تھا۔ تو دوسری طرف دال بھات کا۔ چار ہی آنے میں دو بڑی بڑی روٹیاں، پیاز، چٹنی اور مٹن کے سالن کی ایک خاصی بڑی رکابی مل جاتی تھی۔

بھات میں ابلے چاول ہوتے اور دال کی کٹوری جس میں دال کے شوربے کے علاوہ موسمی سبزیوں کے دو چار چھلکے بھی ہوتے۔ کبھی گاجر کے تو کبھی بیگن یا گوبھی کے ساتھ میں پیاز چٹنی اور اچار کی دو بڑی بڑی پھانکیں۔ رائی ہلدی اور نمک مرچ کو سرسوں کے تیل میں چھونک کر بنایا ہوا شلغم اور گوبھی کا یہ اچار بڑا ہی لذیذ ہوتا۔

رام رحیم جگری دوست اور دھرم کرم والے دکان دار تھے۔ ہر گاہک سے ان کا سلوک ہمیشہ ایک سا رہتا۔ مجال تھا کہ کسی کو دوسرے سے کم دال چاول ملیں یا گوشت کے سالن کے ناپ تول میں کسی طرح کی کمی رہ جائے۔

بھات کی کوئی طے شدہ قیمت نہ تھی۔ ہر کوئی اپنی ضرورت اور بساط کے مطابق

کھاتا۔ ایک وقت میں آنے سے لے کر پورے آٹھ دس آنے کا بھات ایک آدمی کھا سکتا تھا۔

گوشت روٹی اور دال چاول کے علاوہ ان کی دکان کے اندر ایک تیسرا اسٹال بھی تھا جسے چارلی نام کا ایک خوش مزاج اور چلبلا عیسائی چھوکرا چلاتا تھا۔ چارلی کے اسٹال پر کرکٹ چائے کے علاوہ آلو پیاز بیگن گوبھی وغیرہ کے کُرمُرے پکوڑے بھی ملتے تھے۔

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی اس دکان کے گاہک تھے۔ دال چاول اور گوشت روٹی کھانے والے کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اندر سے ایک دو آنے کے پکوڑے بھی منگوا لیتے۔ چائے پینے والے تو دن بھر آتے جاتے رہتے تھے۔

بمبئی میں ایسی دکانیں بھی تھیں جہاں طرح طرح کی جوٹھن بکتی تھی۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کا بچا کھچا یا بد دماغ گاہکوں جھوٹا چھوڑا ہوا کھانا۔ ان دکانوں کے گاہک اکثر بھکاری یا ایسے مزدور پیشہ لوگ ہوتے جنھیں اچھا کھانے کا شوق تو ہوتا مگر جو خریدنے کی توفیق نہ رکھتے۔ یہ لوگ اس قسم کا ملا جلا ست رنگا کھانا بڑے چاؤ سے سستے داموں خرید کر کھاتے۔ اکثر لوگ یہ کھانا خرید کر گھروں کو بھی لے جاتے۔

ایسی ہی ایک دکان کریم موالی کی تھی جسے وہ اسی سڑک کے ساتھ لگی ایک گلی میں بند دروازوں کے پیچھے چلاتا تھا۔ اس دکان پر تین بڑے بڑے بھگونے رکھے ہوتے۔ ایک میں ملا جلا گوشت، مانس مچھلی مرغ انڈے وغیرہ ہوتے۔ دوسرے میں طرح طرح کی سبزیاں اور تیسرے میں ملی جلی دالیں۔ ان تینوں بھگونوں کے علاوہ اس کے پاس ایک بڑی ایلومینیم کی پرات ہوتی جس میں طرح طرح کے چاول پلاؤ بریانی وغیرہ ملے ہوتے تھے۔

اس ملے جلے گنگا جمنی کھانے کو شرفا کے دسترخوان کا جامہ اوڑھانے کے لیے یہ دکان دار اپنی طرف سے ابلے ہوئے تازہ چاول اور روٹیاں بھی بنوا لیتا۔ کریم کے ہوٹل دجسے لوگ کریم کدہ کے نام سے پکارتے تھے، میں وہی لوگ جاتے تھے، جنھیں وہاں دیکھے جانے میں شرم و حیا قسم کے کسی جذبہ یا رکاوٹ کا خوف نہ ہوتا۔ ایسے لوگ بغیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے اس دکان پر آتے جاتے۔ زیادہ تر گاہک البتہ کھانا پیک کروا کر لے جاتے یہ بہانہ کر کے کہ وہ یہ کھانا اپنے کتوں کے لیے لے جا رہے ہیں۔ یہ دکان اور ایسی دوسری دکانیں جو بمبئی میں کئی جگہ دیکھی جاتی تھیں۔ بلڑ بازی کے اڈے ہوتیں، اور شریف آدمی ان کے قریب سے گزرتے

ہوئے بھی کتراتے۔

رام رحیم اور چارلی کا ہوٹل اس کے برعکس ایک غریب نواز اور عزت دار جگہ تھی، اور یہ لوگ اپنے گاہکوں کو اپنے سرپرست، اور مربی مانتے تھے اور بڑے ہی احترام و اہتمام سے کھانا پروستے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے ہمارے گاہک ہماری طرح غریب ضرور ہیں۔ مگر ہیں سب کے سب خاندانی۔ کریم کدہ کے لفنگوں کی طرح کے نہیں۔

جو ٹھن بیچنے اور کھانے والے الگ حیران ہوتے کہ جب ایسے داموں میں مرغن غذائیں دستیاب ہیں تو یہ احمق سر پھرے لوگ ایسی بے مزہ اور واہیات چیزیں کیوں کھاتے ہیں۔

راجندر کو بمبئی آئے چھ مہینے ہو چلے تھے۔ وہ پنجاب میں اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور ماضی کو فراموش کر کے تلاش معاش میں بمبئی آیا تھا۔ پہلے وہ کشیر پنجاب میں کھاتا تھا پھر خالصہ میں کھانے لگا۔ مگر جب پونجی کم ہوتی دکھائی دی اور کوئی ڈھنگ کا کام ملنے کی امید بھی تقریباً جاتی رہی تو اپنے ہی ایسے ساتھی کے مشورہ پر اس نے رام اور رحیم کے یہاں کھانا شروع کر دیا کبھی گوشت روٹی، کبھی دال چاول اور منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی ساگ میں چارلی کے پکوڑے۔ راجندر کا ساتھی جو گزیٹیڈ ہوتے ہوئے بھی بمبئی کی ایک فلک شگاف عمارت کا لفٹ مین تھا خود بھی رام اور رحیم کا گاہک رہ چکا تھا۔

آٹھ دس آنے میں اس کا دن بھر کا گزر ہو جاتا۔ حالات کو سنورتے نہ دیکھ کر دو بار کے بجائے اس نے ایک ہی بار کھانا شروع کر دیا۔ وہ بھی دوپہر بعد یعنی دو اور تین بجے کے درمیان جب دکان میں سرے گاہک عموماً نہ ہوتے۔ اس طرح ایک وقت کھا کر بھی وہ اپنی دن بھر کی ضرورت پوری لیتا۔

زندہ رہنے کے لیے آدمی کو چاہیئے ہی کتنا۔

رام اور رحیم اسے روز دیکھتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھتے "تم دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں" اور جب اطمینان ہو جاتا کہ وہ دونوں ہی جانتے ہیں کہ کیا دیکھ رہے ہیں تو کچھ اس طرح معصوم ہو کر بیٹھ جاتے گویا ان کو اس سے قطعی کوئی سروکار نہ ہو کہ کون کتنا کھاتا ہے چار آنے کا کھاتا ہے یا دو آنے کا۔ ایک وقت کھاتا ہے یا دونوں وقت۔ اس کے لیے ان کے دلوں میں وہی عزت تھی جب وہ پورے آٹھ آنے ایک وقت میں لٹا

دیتا تھا۔

سوال یہ نہ تھا کہ کون کیسا اور کتنا بڑا گاہک ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ ان کا گاہک ہے۔ ایک مستقل گاہک۔ ایک سرپرست۔ مربی۔

وہ اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے خوش آمدید کہتے اور کبھی بھولے بھی نہ پوچھتے کہ وہ آج کل اتنا کم کیوں کھاتا ہے۔ کھانے کے لیے اتنی دیر سے کیوں آتا ہے اور پورے دن میں ایک ہی بار کیوں کھاتا ہے؟

جب ہر طرح کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی اسے کوئی معقول کام نہ ملا تو اس نے اپنی ایم اے کی ڈگری کو صندوق میں حفاظت سے بند کر دیا اور ہر چھوٹا موٹا کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا جو اسے آسانی سے مل جاتا۔ زندگی کی گاڑی کسی طرح چلنی چاہیئے۔

اپنے گریجویٹ لفٹ مین دوست کی معرفت وہ کتنے ہی لفٹ مینوں سے روشناس ہو چکا تھا۔ لفٹ مینوں کی اپنی ایک مخصوص برادری تھی اور وہ لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ جب کبھی کسی بڑی بلڈنگ کا لفٹ مین چھٹی پر جاتا تو اسے اپنی جگہ رکھوا جاتا۔ کبھی دن دو دن کے لیے اور کبھی ہفتہ دو ہفتہ کے لیے۔

اسی قماش کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے وہ کسی طرح اپنی گزر بسر کر رہا تھا۔ دن میں ایک بار چپ چاپ آکر وہ دال چاول کھا جاتا۔

ایک بار وہ اسی طرح فورٹ کی ایک بڑی عمارت کے لفٹ مین کی جگہ کام کر رہا تھا کہ اس کی مڈبھیڑ اسی عمارت کے اٹیک والے سب سے بڑے فلیٹ کے مالک پاریکھ صاحب سے ہو گئی۔ یہ بزرگ عمارت کی سب سے اہم اور دلچسپ ہستی مانے جاتے تھے۔ سبھی ان کا احترام کرتے تھے۔ خوش اخلاق، خوش زبان اور خوش لباس یہ بوڑھا اتنے بڑے فلیٹ کا اکیلا مالک اور مکین تھا۔ راجندر کو بڑی سلجھی ہوئی انگریزی میں گفتگو کرتے دیکھ کر بوڑھا پاریکھ چونک گیا۔ دو ایک سرسری ملاقاتوں کے بعد جب اسے پتہ چلا کہ راجندر انگریزی ادبیات کا ایم اے اور عالمی ادب کا معقول شناسا ہے تو اس نے لفٹ مین چھوکرے کی ذات میں خاصی گہری دلچسپی لینی شروع کر دی۔

اس سے پہلے کہ پاریکھ صاحب کی یہ دلچسپی کوئی رنگ لاتی عمارت کا اصلی لفٹ

مین آگیا اور راجندر کو چھٹی مل گئی۔

کئی روز بعد ایک دن راجندر حسب معمول اپنا دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ اس کی نظر دکان کے اندر چارلی کے کاؤنٹر کے قریب والی میز پر بیٹھے ایک بزرگ پر جا کر رک گئی یہ پاریکھ صاحب تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ مگر دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے کھاتے پیتے رہے۔

جب کھا پی کر اور پیسے دے کر جانے لگے تو پاریکھ صاحب نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ دونوں ایک ساتھ دکان سے باہر آئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کافی دیر یونہی چپ چاپ چلے جانے کے بعد آخر کار راجندر نے خود ہی مہر سکوت توڑا۔

"آپ یہاں کیسے آگئے؟" وہ حیران تھا کہ ایسا صاحب ثروت آدمی رام اور رحیم کی دکان پر کیا لینے آیا ہے۔ اسے یہ بھی لگا کہ وہ اسی کے لیے یہاں آیا ہے۔

بوڑھے نے بلا جھجک جواب دیا۔ "جیسے تم آتے ہو ویسے ہی میں بھی چلا آیا۔"

میری بات اور ہے۔

وہ کیوں؟

میں فٹ پاتھ کا آدمی ہوں اور میرے یہاں کھانے میں ہرج نہیں۔ مگر آپ کو یہاں چائے پیتے دیکھ کر کوئی بھی حیران ہو سکتا ہے۔

اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ چارلی کی چائے تو خاصی معقول ہوتی ہے تو یہ چائے والے کا نام بھی جانتا ہے۔

"ایسی سستی سنفیانہ چائے بھی آپ پی لیتے ہیں۔؟

چائے اچھی ہے اور سستی بھی۔ مگر ایسی چالو بھی نہیں۔ چارلی اس معاملے میں آرٹسٹ ہے۔ میں تو اکثر جب کبھی بھی ادھر سے گزرتا ہوں تو ایک پیالی ضرور پیتا ہوں۔

ظاہر تھا کہ وہ محض اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا ادھر نہیں آیا تھا۔ ایسے ہی اچانک آنکلا تھا۔

جو بھی ہو۔ ایسی جگہوں پر دیکھا جانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔

میرے لیے کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے یہ تم کیسے جانتے ہو۔؟

میں نے تو بس یونہی کہہ دیا تھا۔ ویسے یہ آپ کا نجی معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے۔

تم ہر روز یہیں کھاتے ہو؟

اس سے بھی سستی کوئی دوسری جگہ ہو تو بتا دیجئے۔

قریب ہی گلی میں کریم سیٹھ کی دکان ہے۔

جوٹھن؟

کیا برائی ہے۔ کھانے کی کوالٹی اور ذائقہ تو ظاہر ہے کہ وہیں بڑھیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس ڈھابے سے سستا نہیں تو مہنگا بھی نہیں۔

ذائقہ کی حس اسی آدمی کو پریشان کرتی ہے جو محض کھانے کے لیے زندہ ہے میرے ایسے آدمی کو نہیں، جو صرف زندہ رہنے کے لیے تھوڑا بہت کبھی کھا لیتا ہے۔

کیا واقعی دوسری کوئی وجہ نہیں؟

ایک اور وجہ بھی غالباً ہے۔

جھجھک؟

نہیں۔ تاج اور ویسٹ اینڈ کی جوٹھن کھانے کے بعد میں تاج اور ویسٹ اینڈ کے کھانوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دوں گا۔ فی الحال اس قسم کی تحقیق کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے نہ ذرائع۔

ذرائع مہیا ہو جائیں تو؟

تب کی بات دوسری ہے۔ تب تو ظاہر ہے کہ وہیں کھانا پسند کروں گا جہاں کا جوٹھن کریم بیچتا ہے۔

تم دل چسپ آدمی ہو۔

جی شکریہ!

ذہین ہو، اور دیکھتا ہوں مجھ سے بہتر بھی۔

اس بار اس نے جواب نہیں دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ بوڑھا پارکھ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے اپنی طرف سے کچھ نہ کہہ کر وہ انتظار کرنے لگا۔

بوڑھا کچھ دیر رکا رہا۔ پھر بولا: "ایسا ایک وقت مجھ پر بھی آیا تھا۔ مگر رام اور رحیم کے ڈھابے کی بجائے میں کریم کدہ میں ہی کھایا کرتا تھا۔ جب مدتوں مجھے کھاتے کھاتے اس کھانے کی

عادت ہوگئی یا سمجھو کہ لت پڑ گئی تو میں نے وہاں کھانا کھانے کے ذرائع تلاش کرنا شروع کر دیئے ، جہاں کی بچی کھچی جوٹھن کریم بیچتا ہے اور میں نے وہ ذرائع بھی بالآخر ڈھونڈ نکالے۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ میں ایک بڑے سجے سجائے آرام دہ فلیٹ کا واحد مالک ہوں، اور آج میرے پاس خدا کے فضل سے سب کچھ ہے۔

یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔

تاکہ تم بھی میری طرح ان ذرائع کی تلاش شروع کر دو۔

یعنی کریم کے یہاں کھانے لگوں۔

تھوڑی دیر کے لیے۔ ہمیشہ کے لیے نہیں۔

درجن مختلف بستروں پر اپنی مرضی بلکہ خوشی سے سوئی ہوئی عورت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

عام زبان میں تو اسے فاحشہ کہیں گے۔

میں اسے فاحشہ نہیں کہوں گا۔ اپنی پسند سے جگہ جگہ سونے والی عورت فاحشہ نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی عورت ہوتی ہے جسے زندگی کی ان قدروں سے کوئی واسطہ نہیں جو عام لوگوں کے لیے قابل احترام ہیں۔

میں تمہارا مطلب سمجھ گیا مگر میرے عزیز ایسی عورت معاشرے میں عزت سے نہیں دیکھی جاتی بلکہ سوسائٹی کا ناسور تصور کی جاتی ہے۔

میں اپنی راہ پر چل رہا ہوں بھلے ہی کسی قدر لڑکھڑا کر مگر غریبی کوئی ایسا روگ نہیں کہ جسے بلاوجہ چھپایا جائے۔ آپ کی تجویز کی ہوئی عیاشی کو تو میں اپنی موجودہ حالت سے بھی پست درجہ سمجھتا ہوں۔ ایک صحت مند آدمی کو مریض بن جانے کا مشورہ دینا کہاں تک واجب ہے یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔!

تم ایک کردار ہو اگرچہ کسی حد تک خود پسند!

خود نما تو نہیں۔

میں تم سے بہت خوش ہوں۔ کام کرو گے؟

کام ہی کے لیے تو بمبئی آیا ہوں۔ مگر ایکدم امیر آدمی بن جانا بھی میرے لیے مناسب نہ ہوگا

"تو جیے ہزار برس، اور ہر برس کے ہوں دِن پچاس برس"۔

یہ شعر تو میرے بھیّا میرے ہر جنم دِن پر بولتے تھے۔

میں دِل سے کہہ رہی ہوں، میری ننھی گڑیا کہ تجھے میری عمر بھی لگ جائے۔

یہ بھی رسمی بات ہے دیدی۔ اماں اننت بھیّا کو روز ایسی دعائیں دیتی تھیں۔ مگر اُن کی کوئی دُعا لگی بھی میرے بھیّا کو! ہفتہ بھر بھی بیمار نہ رہے اور چل دیئے چپکے سے۔ جب ہم سب سو رہے تھے اور نانی سالہا سال مرنے کی دُعائیں مانگتی رہیں مگر مری تبھی جب اُن کی باری آئی ہم سب اپنی باری آنے پر ہی مرتے ہیں، رہٹ کے اِن ڈولوں کی طرح، ایک کے بعد ایک، آتے ہیں، جاتے ہیں، آتے ہیں تو بھرے لدے، جاتے ہیں تو خالی اپنے جسم کے وستر تک ساتھ نہیں لے جاتے۔

تو، تو پچھلے جنم کی کوئی فلسفی ہے۔ مگر تو سچ کہتی ہے۔ ہر کوئی پیدا ہوتا ہے، پنپتا ہے، بڑا ہوتا ہے۔ بڑھتا پھیلتا ہے اور آخر میں مُرجھا کر جھڑ جاتا ہے، مرجاتا ہے۔ یہی رہٹ کی کہانی اور زندگی کی سچّائی ہے۔ اِس کا آدمی ہے نہ اننت، یہ اننت ہے۔ مگر سچ شاید یہ بھی نہیں۔ دیکھو نہ اننت بھیّا کتنے سندر، کتنے پیارے تھے مگر چُھٹپن ہی میں مر گئے۔ وہ کہاں بڑھے پنپے، پھیلے؟ نام کا اننت ہونے سے کوئی اننت تھوڑے ہی ہو جاتا ہے۔ اننت کچھ ہے تو صرف زندگی ہے۔ رہٹ کے ڈولوں کا اپنے محور کے گرد گھومنا، گھومے جانا، نیچے جانا، اُوپر آنا بس اننت کچھ ہے تو یہی ہے۔ کوئی ڈول نجی طور پر اننت نہیں۔

ہر کوئی جو دیکھتا ہے۔ دیکھتا ہے جنم بھی اور مرن بھی۔ مگر صرف دوسروں کا جنم اور مرن ہی دیکھتا ہے، اپنا نہیں۔ زندگی کو نہیں سمجھتا جو جینے اور مرنے سے بڑی ہے۔ جنم کا منبع موت تو زندگی کی ابدی آرام گاہ ہے۔ جیسے وہ بستر جس پر ہم دِن بھر کی محنت و مشقت کے بعد رات کو تھک کر سو جاتے ہیں۔ دِن

کیونکہ میں اس مٹی کا آدمی نہیں ہوں۔

میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ قدر اسی چیز کی ہوتی ہے جو مشقت سے حاصل ہو۔

میں چاہوں گا کہ تمہارے ہاتھ اقتدار آئے۔ پیسے بھی آئیں مگر آہستہ آہستہ اور اسی تناسب سے جس تناسب سے تم ان کے حصول کے لیے محنت کرو۔

میں کام کروں گا۔

"جب تمہارے پاس پیسے آجائیں گے اور اقتدار آجائے گا تو کیا کرو گے؟"

"ان کا واجب استعمال۔ ہاں اس کریم کدہ کو ضرور بند کرانا چاہوں گا جو آدمی کی بھوک مٹانے کے عوض اس کا وقار مانگتا ہے اس سے بڑی لعنت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز آوارہ کتوں کا حق ہے وہی آدمی کی خوراک بنادی جائے۔

"میں یہ اقتدار مہیا کرنے کا وعدہ تو نہیں کرتا مگر تم جسے ایمان کی روٹی کہتے ہو اس کا انتظام کر سکتا ہوں۔ علاوہ ازیں میرے عزیز یہ کریم کدہ کوئی ایک واحد ادارہ نہیں بمبئی میں ایسی درجنوں دکانیں ہیں ان سب کو بند کروا دینے کے لیے جس قسم کا اقتدار و رسوخ چاہیئے وہ میرے پاس نہیں ہے۔ فی الحال تم میرا یہ کارڈ لے لو اور کل صبح میرے اخبار میں کام شروع کر دو۔"

اخبار کا نام پڑھ کر راجندر کی آنکھیں چندھیا گئیں اور احترام سے اس کا سر جھک گیا۔

پاریکھ نے اپنے نوجوان ساتھی کی الجھن مٹانے کے لئے ایک بڑا مخلصانہ قہقہہ لگایا۔ اور اس کے جھکے ہوئے کندھے پر پدرانہ تھپکی دیتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا اب ایک آخری بات بتاؤ۔ آج اور کچھ اب تم سے نہ پوچھوں گا۔ ایمان سے کہنا۔ "کیا رام اور رحیم کے ڈھابے کا کھانا تمہیں اچھا لگتا ہے۔؟"

"آپ یقین مانیئے۔ یہ کھانا واقعی مجھے خاصہ لگتا ہے۔ میں دوسری کسی جگہ کبھی نہیں کھاتا۔ لہٰذا یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں کھانا فلاں فلاں جگہ کے مقابلہ میں کیسا ہے۔ اچھا لگنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ میری ضرورت اور پیٹ کی بھوک ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ رام اور رحیم کورے تاجر نہیں ہیں۔ بڑے شریف اور مخلص انسان ہیں جو اپنے حقیر سے حقیر گاہک کو بھی کبھی چھوٹا نہیں محسوس ہونے دیتے۔ جس کھانے سے آدمی کی بھوک مٹ جائے

اور اسے ندامت بھی نہ ہو وہ کھانا تو ظاہر ہے کہ اچھا ہی کہلائے گا۔

بوڑھے پاریکھ نے ایک بار بھرپور قہقہہ بھرا۔

تم واقعی ایک کردار ہو۔ اب اس بارے میں پھر کبھی بات چیت کریں گے۔

کچھ سال بعد۔

وہ اسی تین ہوٹلوں والی سڑک سے اپنی نئی فیئٹ میں گزر رہا تھا کہ اچانک ایک جانی پہچانی آواز سن کر رک گیا۔

"راجن بابو، راجن بابو"، پکارتا ہوا ایک آدمی بھاگا بھاگا اس کی طرف آرہا تھا۔ کار کی کھڑکی کے قریب پہنچ کر بڑے احترام سے سلام کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"مجھے پہچانا نہیں راجن بابو۔"

"ارے ہاں رحیم بھائی۔" اور وہ کار کو وہیں سڑک کے کنارے روک کر باہر نکل آیا اتنے میں رام بھی آگیا اور چارلی بھی۔

تین پرانے حبیب ——— اسے بڑا اچھا لگا۔

"ہم نے کتنی بار آپ کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے۔ مگر بلانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آج آپ کی کار کی رفتار ذرا کم تھی اور میں خود بھی بیکار بیٹھا تھا۔ حوصلہ کر کے بلا لیا۔ اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو دو چار منٹ بیٹھئے میرے ساتھ۔"

اس دعوت کے تناظر میں جو بے پناہ پیار اور خلوص تھا وہ چھلک چھلک پڑتا تھا۔ وہ رک گیا۔ وہ شیر پنجاب میں کھانا کھانے جا رہا تھا یہ بتانے کی ہمت اسے نہ ہوئی ———

آپ نے تو کمال کر دیا راجن بابو۔ یہ آپ ہی کے قلم کا جادو ہے جو آج اس علاقہ میں جوتھن کی ایک بھی دکان نہیں بچی۔ ایرانیوں کے ہوٹل کا پچا کھچا کھانا آج بھی بکتا ہے مگر وہ پہلے ایسی بات نہیں رہی۔ سنتے ہیں کہ آپ ہی نے آرٹیکل پر آرٹیکل لکھ کر میونسپلٹی کے باباؤں کو غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا ہے۔

چارلی نے رام اور رحیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کھانے کا وقت ہے راجن بابو" اگر

برا نہ لگے تو آج ہمارے ہی یہاں دو کور کھالو۔ یہ آپ کی اپنی دکان ہے۔ اور آج اس کا رنگ ڈھنگ جو کچھ بدلا سنورا ہے تو آپ ہی کی بدولت ،،

مسکراتے ہوئے رحیم نے کہا۔ آج کل میرے گوشت کے سالن میں پہلے جیسا پانی نہیں ہوتا اور بوٹیاں بھی میں نے دو کی تین کر دی ہیں۔

چاروں نے بلند آواز قہقہہ لگایا۔

کیسے پیارے لوگ ہیں یہ۔

بڑے اہتمام سے رحیم نے گوشت روٹی اور رام نے دال چاول پروسے۔ چارلی گرم گرم تازہ پکوڑوں کی پلیٹ لے آیا۔

ایک ساتھ وہ ساری پرانی لوازمات۔

راجندر ہاتھ منھ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

بڑی مشکل سے دو چار کور کسی طرح نگل کر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ گوشت کی بوٹیاں آج کسی قدر کچی رہ گئی ہیں کیا۔ دال چاول بھی غالباً تنک جل گئے سے لگتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی باس آرہی ہے۔

رام اور رحیم چپ ہو گئے۔ چند منٹ پہلے والی وہ دوستانہ مسکراہٹ جس نے ان کے چہرے کندن کی طرح جگمگا دیئے تھے ایکا ایک نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔

وہ کھانے سے نظر اٹھاتا تو دیکھتا کہ اس کی اس بظاہر بے ضرر رائے زنی کا اس کے میزبانوں پر کیا اثر ہوا ہے وہ کھانے میں جٹا رہا اور اپنے پرانے رفیقوں کی محض خوشی کی خاطر اس نے باقی کے چند کور بھی کسی طرح نگل لئے۔

کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے اس نے پانی کا لوٹا مانگا تو باقی دکان کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی نظر رام اور رحیم کے چہروں پر جا ٹکی۔ چند لمحے پہلے والے وہ شاد و مسرور چہرے اداس بے حد اداس ہو گئے تھے، گویا کہہ رہے ہوں۔

دال چاول وہی ہے اور گوشت روٹی بھی وہی ہے سیٹھ مگر تم اب وہ نہیں ہو تم نے اتنا بھی کھا لیا۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے۔ تم نے مان تو رکھ لیا۔ پرانی دوستی کا۔

ندامت و شرمندگی نے اس کی زبان پر تالا لگا دیا۔ پیسے دینے کے لیے اس نے جیب میں

ہاتھ ڈالا تو رام اور رحیم ایک ساتھ چلا اٹھے ۔اب اور ذلیل نہ کرو سیٹھ۔

وہ کار میں بیٹھ گیا مگر آگے شیر پنجاب کی طرف نہ بڑھ سکا۔ وہیں سے واپس لوٹ گیا۔

کار چل رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا ——— ۔کار کی رفتار اور اس کی سوچ۔کار تیز ہوتی تو سوچ بھی بلند آواز ہو جاتی۔ کار دھیمی پڑ جاتی تو سوچ بھی اونگھنے لگتی ۔اس کا شعور سوتا جار ہا تھا۔

کار اب اس کے گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔کتنی ہی دیر وہ اسی سوتے جاگتے عالم میں اپنی سیٹ میں دھنسا رہا۔ وہ کیا جواب دیتا۔

بات پرانی ہے ایک یگ پرانی۔

بوڑھے پاریکھ نے وہ بات یاد رکھی ہوتی اور آج پوچھ بیٹھتا۔

"بتاؤ برخوردار اب بھی تم پہلے کی طرح رام اور رحیم کے "دھابے" کا کھانا کھا سکتے ہو۔"

بنے پٹ کے ہم جوگاماں

ہم کوئی خاندانی رئیس یا نواب وغیرہ تو خیر نہیں۔ مگر طبیعت اپنی روایتی نوابوں ایسی ہی ہے۔ یعنی کہ جہاں ریس کے گھوڑوں یا جنگلی ہرنوں کی طرح قلانچیں بھر بھر کر جلد از جلد پہنچنا اور لپک کر منزل کو جالینا مقصود و ضروری ہو، وہاں بھی ہم خراماں خراماں مٹر گشتی کے عالم میں ہی پہنچنے کے عادی ہیں۔ ہم کھڑے رہنے کی نسبت بیٹھنے اور بیٹھنے کی نسبت لیٹنے بلکہ لیٹے رہنے کے حق میں زیادہ ہیں۔

صبح کی سیر ورزش، کھیل، تماشے بلکہ جسم و جان کو اذیت پہنچانے والی ہر ایسی حرکت سے ہم نے ہمیشہ گریز فرمایا ہے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں بھی کبھی کوئی آؤٹ ڈور گیم نہیں کھیلے۔ عام دنوں میں آٹھ بجے اور چھٹیوں میں دس گیارہ بجے سے پہلے ہم نے کبھی بستر نہیں چھوڑا۔ لہٰذا ہمارے دوست احباب اور قریبی رشتہ دار پچاس سال کی عمر میں ہمارے یوگ ابھیاس اور صبح و شام کی سیر میں اچانک اس طرح الجھ جانے سے کافی حیران و نالاں ہیں، اور تو اور ہماری چہیتی بیگم بھی اس انقلاب کو زندہ باد کہنے کی بجائے ہر روز ہم پر طنز کیا کرتی ہیں۔

"یہ سب حضرت نے پہلے کیا ہوتا تو آج تیس سال کی سروس کے باوجود سیکشن آفیسر جیسی واہیات اسامی تک ہی نہ رکے رہتے۔"

ان بیگم کو کون سمجھائے کہ ہم یہیں تک پہنچ گئے ہیں یہی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ انھیں اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ کچھوے کی رفتار سے چل کر بھی ہم کہیں تو آخر پہنچ ہی

گئے ہیں۔

اس انقلاب کی وجہ ہم نے بیگم کو نہیں بتائی۔ دوستوں عزیزوں پر بھی یہ راز ابھی تک افشا نہیں کیا، مبادا ہم ان کے طنز و مزاح اور پھبتیوں کا نشانہ بن جائیں۔ آپ اردو والے تو دوست ہیں نہ دشمن، خوش قسمتی سے ہمارے گھر والے اردو نہیں جانتے۔ ہمارے دوست احباب بھی انھیں کی طرح ہیں بدنصیب ہیں، لہٰذا آپ سے کیا پردہ، سنیئے۔

۱۵ر نومبر ۷۴ء کی وہ شام ہمیں تاعمر نہیں تو ایک مدت تک تو ضرور یاد رہے گی، موسم خاصا سہانا تھا، ہوا میں کسی قدر خنکی تھی مگر سردی جسے دلی کی سردی کہتے ہیں قطعی نہ تھی۔ دفتر سے ہم سات بج کر بیس منٹ پر اٹھے تھے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے نہیں، محض اس لیے کہ ہمارے بڑے صاحب بہادر اٹھے ہی سات بجکر پندرہ منٹ پر تھے۔ منہ ہاتھ دھونے اور بال وغیرہ سنوارنے میں دو ایک منٹ اور دفتر کے عین سامنے بس اسٹاپ تک پہنچنے میں بھی اتنا وقت اور لے لیجئے۔ یعنی کہ واپس گھر لوٹنے کی غرض سے جب ہم بس اسٹاپ پر تشریف لائے تو وقت ساڑھے سات کے قریب ہی کا رہا ہوگا۔ بس اسٹاپ پر مقامی مونسپل کمیٹی کی بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ پان سگریٹ اور کوکا کولا وغیرہ کی دکان جسے کانگڑہ کے دو جڑواں بھائی رام اور شیام چلاتے ہیں۔ ہمارا معمول ہے کہ ہم گھر لوٹنے سے پہلے سگریٹ لینے رام لال کی دکان پر ہی جاتے ہیں۔

دکان کے پچھواڑے میں چند نوجوان چھوکرے کوکا کولا اور سگریٹ وغیرہ پی رہے تھے اور بڑی ہی فحش مگر دل دار قسم کی گفتگو میں مشغول تھے، ہم نے ان کی باتوں کو سنا ان سنا کر کے رام لال سے اپنی پسندیدہ برانڈ کا سگریٹ مانگا۔ رام لال کے پاس ایک ہی ڈبیا تھی اس برانڈ کی جو اس نے بڑے احترام و اہتمام سے نکال کر ہمیں تھما دی۔ ڈبیا ابھی ہمارے ہاتھ میں بھی نہ آئی تھی کہ پچھواڑے بیٹھے نوجوانوں میں سے ایک نے اچانک آگے بڑھ کر عقاب کی سی تیزی اور عیاری سے رام لال کے ہاتھ سے چھین لی۔

"سالا کہتا تھا پنامہ نہیں ہے اور ان حضرت کو بن مانگے دے رہا ہے"۔

"یہ پیکٹ ان صاحب کے لیے ہی رکھی ہوئی تھی میں نے، یہ میرے روز کے گاہک ہیں، اور ہمیشہ صرف یہی سگریٹ پیتے ہیں۔ رام لال نے انکار کی وجہ بیان کی۔

"اس کا پیسہ کونے کا ہے اور ہمارا تانبے کا؟"

"آپ لوگ ناراض نہ ہوں آپ کو یہ ڈبیا ہی تو چاہیئے۔ سو آپ لے لیجئے ہم آج کسی اور سگریٹ سے گزارہ کر لیں گے"، ہم نے اپنی عادت کے مطابق جھگڑا مٹانے کی غرض سے کہا۔

بس اسٹینڈ پر جو دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ غالباً پہلے ہی سے ان نوجوانوں کی وجہ سے خاصی پریشان تھیں ان میں سے ایک لڑکی نے جو نسبتاً کچھ دلیر واقع ہوئی تھی ہمارے قریب آکر کہا۔ "انکل یہ ہر کسی سے بلاوجہ الجھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک بزرگ ان سے پریشان ہو کر اگلے بس اسٹاپ کی طرف پیدل ہی چل دیے تھے۔ ہم دونوں پر بھی یہ لوگ گندے ریمارکس بلاوجہ کسے جا رہے ہیں۔"

"ارے ہٹ گشتی کہیں کی" وہی لڑکا پھر کہ چلایا۔

"گشتی کسے کہتے ہیں۔ جانتے ہو برخوردار"، ہم نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"تم ماموں لگتے ہو اس رنڈی کے لباس تو دیکھو اس کا مردوں ایسے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ہم نے تو اسے اپنی ہی عمر کا لڑکا سمجھ کر محض تفریحاً ایک دو پھبتیاں کسی تھیں۔"

"ہمیں آپ کا ماموں بننے سے قطعی کوئی انکار نہیں اور نہ ہم لفظ ماموں کو گالی سمجھتے ہیں آپ اپنی والدہ ماجدہ سے ہمارا اتنا قریبی رشتہ قائم کر رہے ہیں ہمیں اس کا فخر ہے۔ ہم ہر معزز بیاہتا خاتون کو اپنی بہن ہی سمجھتے ہیں۔ تمہاری والدہ ہمیں یقین ہے کہ شادی شدہ تو ہوں گی ہی۔"

"ابے دیکھا نہیں بڈھا گالی دے رہا ہے۔"

یہ سب کچھ ایسی سرعت اور تیزی سے ہوا تھا کہ ہمیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب ہم نے طیش میں آکر سنسناتی زناٹے دار چپت اس دوسرے پھوکرے کے پھولے ہوئے گالوں پر دے ماری پھر کیا تھا۔ پورا ہنگامہ کھڑا ہو گیا ایک دم۔ پانچوں کے پانچوں لڑکے ہم پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ وہ پانچ اور ہم اکیلے۔ ہمارے لیے تو ان میں سے کوئی دو ہی کافی رہتے پانچ تو ایک دم ایک مسلح فوج تھی۔ یہ عجیب بے تکی لڑائی تھی۔ ایک جانب تو دن بھر کے تھکے ہارے ہم بیچارے ادھیڑ عمر بزرگ اور دوسری طرف پانچ تر و تازہ نوجوان چھوکرے۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

وہ لڑ رہے تھے مگر بڑے ہی محتاط ڈھنگ سے۔ ہمارے قریب کوئی نہ آتا تھا ظاہر تھا کہ ہمارے غصیلے طمانچے نے انھیں خبردار اور محتاط کر دیا تھا۔ دوسری وجہ ہمارا لحیم شحیم بدن تھا۔ باپ داداؤں کی میراث۔

لڑکوں نے تو جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا کہ ہمارے قریب آنا خالی از خطرہ نہ تھا۔ ہٹ اور ڈن کا طریق کار اپناتے ہوئے ہمارے چاروں طرف شہد کی مکھیوں کی طرح گھوم گھوم کر گھونسوں، پاؤں اور ٹانگوں سے وہ ہماری خاطر مدارت کیے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار محض اتفاقاً ہمارا ایک آدھ گھونسہ کسی چھوکرے کی کنپٹی پر جم جاتا تو وہ درد سے کراہ اٹھتا جس سے پٹتے پٹتے بھی ہمارا موراں کسی قدر سنبھلا رہتا۔

جانے کتنی دیر تک ہم ایسے ہی پٹتے رہے۔ وہ پانچوں شاہسوار مار نے پیٹنے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی بکے جا رہے تھے۔ پنجاب کی خالص وزنی گالیاں۔ اکثر گالیاں تو روایتی تھیں مگر کچھ ایک قطعی نئی تھیں، جن سے ہمارے کان آشنا نہ تھے۔ پنجاب نے ہر شعبہ میں ترقی کی ہے جانو، بوجھو تو پتہ چلتا ہے۔ ڈر و خوف کے مارے یا پھر ہم سے ہمدردی کے طور پر وہ دونوں لڑکیاں بھی چیخے چلائے جا رہی تھیں۔

ابھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ اتنے میں ایک بس جو مسافروں سے پوری طرح بھری ہوئی تھی ایکا ایک نہ جانے کہاں سے آکر وہاں رک گئی اور یہ عجیب و غریب تماشہ دیکھ کر بہت سے لوگ اور کنڈکٹر بس سے نیچے اتر آئے۔ جانے ان لڑکیوں نے ان لوگوں سے کیا کہا کہ دیکھتے دیکھتے بس کی آدھی سے زیادہ سواریاں نیچے اتر آئیں اور بغیر پوچھ تاچھ کئے یا تفصیل میں گئے ایک بڑے گروہ نے ان لڑکوں کو ایک دم جیسے دبوچ لیا اور آن کی آن میں دھنک دھنک کر پانچوں کو ادھ مرا کر دیا۔ پھر کنڈکٹر کی وسل سن کر وہ لوگ جیسے آئے تھے ویسے ہی بس میں بیٹھ کر چلتے بنے۔ وہ دونوں لڑکیاں بھی اسی بس میں سوار ہو کر چلی گئیں۔

اب جو منظر تھا دیکھتے ہی بنتا تھا۔ پانچوں نوجوان مردہ لاشوں کی طرح زمین پر چت پڑے کراہ رہے تھے۔ اور ہم اپنے بجی دردوں کو بھول کر اس سوچ میں غلطاں تھے کہ ہم کیوں نہ اسی بس میں سوار ہو کر چلتے بنے۔ مگر یہ ہمارے لیے نئی بات نہ تھی۔ ہم ہمیشہ دیر سے سوچنے کے عادی ہیں۔ وقت پر ہمیں بہت کم وقت کی بات سوجھتی ہے۔ گھر اور دفتر میں اکثر

ہی ہوتا ہے کہ جانتے بوجھتے بھی ہم عین موقع پر موقع کی بات کہنا بھول جاتے ہیں اور بعد میں بلاوجہ اپنے آپ کو کوسنے لگتے ہیں۔ بیگم اور افسر سے پوری پھٹکار سن چکتے ہیں تو کہیں ہمیں مناسب جواب سوجھتا ہے۔ بس چلی گئی تھی تو کیا ہوا۔ ہم بڑی آسانی سے اِدھر اُدھر بھاگ سکتے تھے، مگر یہ ہمیں تبھی سوجھا جب پولیس کی گشتی جیپ بجانے کدھر سے ادھر آ دھمکی۔ جیپ میں ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر و چار سپاہیوں کے علاوہ ایک بزرگ بھی تھے جو غالباً وہی حضرت تھے جن کے بارے میں ان دو لڑکیوں نے ہمیں مہابھارت سے پہلے آگاہ کیا تھا۔ ظاہر تھا کہ دوسرے بس اسٹاپ پر جانے کی بجائے کہیں سے پولیس کو اطلاع دینے چلے گئے تھے۔ جیپ سے اترتے ہی بولے۔ "یہی تھے وہ بدمعاش چھوکرے جو ان لڑکیوں کو چھیڑ رہے تھے۔"

مگر لڑکیاں کہاں ہیں؟ اے ایس آئی صاحب نے تفتیش شروع کی۔

وہ دونوں بس میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ ہم نے بڑی عاجزی سے انکشاف فرمایا۔

آپ کون ہیں؟!

"ہم سامنے کے دفتر میں انڈر سکریٹری ہیں۔" ہم نے مصلحتاً اپنے آپ کو پروموشن دے ڈالی۔

اور یہ لاشیں؟

"یہ مردہ لاشیں نہیں ہیں جناب۔ یہ سب زندہ انسان ہیں اور یہ بھی محض اتفاق ہے کہ ان کے ہاتھوں بھرپور پٹ پٹا کر بھی ہم دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہیں اور یہ لاشوں کی طرح زمین پر بچھے چیخ رہے ہیں۔"

وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں؟ تھانے دار نے طنز کیا۔

آپ جو دیکھ رہے ہیں جناب وہ غلط ہے۔ یعنی کہ اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے اکیلے ان پانچ نوجوانوں کو مار مار کر زمین پر بچھا دیا ہے تو یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے حقیقت اس سے قطعی برعکس ہے۔ یقین نہ ہو تو دکان دار سے پوچھ لیجیے۔

کون سے دکان دار سے؟

رام لال کمبخت نہ جانے کب دکان بند کر کے رفو چکر ہو گیا تھا۔

کے بعد رات ضروری ہے تاکہ ہم سو کر دن بھر کی تھکن اُتار لیں اور صبح جب اُٹھیں تو تازہ دم ہو کر۔ اِسی لیے زندگی کے لیے موت ضروری ہے۔ ورنہ زندگی پہاڑ سی بوجھل بن جائے۔ تم اور ہم، میری گڑیا، رہٹ کے ڈول ہیں، بیچ والے ڈول، نہ پہلے نہ آخری، جنھیں نہ آنے کی ترتیب کا پتہ ہے نہ جانے کی ترتیب کا علم۔

جو پیدا ہونے سے پہلے نہیں تھا، وہ مرنے کے بعد بھی نہیں رہے گا۔ وہ جو درمیان میں ہوا بھی تو اُس کی کیا ہستی۔ یہ بدن جسے سجانے سنوارنے کے لیے تم میرے کپڑوں اور میری موت کی منتظر ہو، یہ زندگی نہیں، میرے کپڑے تمھارے جسم پر ایسے لگیں گے جیسے بجوکا کو آدمی کی پھٹی پرانی قمیض اور پگڑی پہنا کر کھیتوں میں گاڑ دیتے ہیں۔ معصوم پکھیوں کو حیران و ہراساں کرنے کے لیے۔

یہ رہٹ ہے نہ، اِس کا کوئی ایک واحد ڈول زندگی نہیں۔ زندگی ہے رہٹ کے ڈولوں کا اپنے محور پر گھومے جانا۔ یہی ایک کیفیت ہے جو انت ہے، ابدی، ازلی اور سرمدی! مجھے کوئی ایسا پکا یقین نہیں کہ میں پیدا ہوئی تھی۔ ایسی کوئی شکتی بھی نہیں جو یقین دِلا سکے مجھے۔ کسی بھی آدمی کو کہ وہ مرجاتا ہے۔

چھوٹی رو رہی تھی۔ بڑی مسکرا رہی تھی۔ مگر آنسو اُس کی آنکھوں میں بھی تھے۔ سورج کی روشنی میں بارش کی بوندوں ایسی کیفیت!

آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔

ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر ان بچوں کا بھی تو کچھ کیجئے۔

آپ سے جو بن پڑا وہ تو آپ کر ہی چکے ہیں۔ اب ہم سے جو بن پڑے گا ہم بھی کر دیکھیں گے

پولیس کے لوگوں نے لڑکوں کو باری باری اٹھا کر جیپ میں ڈال دیا، اور ان بڑے میاں کو بھی ساتھ لے کر قریبی تھانے کی سمت چل دیے۔

اب وہاں جا کر جو ہوا وہ اور بھی مضحکہ خیز تھا۔

ہم اور بڑے میاں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور وہ پانچوں شاہوار ہمارے سامنے دو بڑے بینچوں پر کسی طرح بٹھا دیے گئے تھے۔

ہر ایک دو منٹ بعد ایک دو حضرات، کبھی باوردی پولیس والے تو کبھی سفید پوش باری باری کمرہ میں تشریف لاتے۔ ایک نظر لڑکوں کی طرف دیکھتے اور پھر گھوم کر ہماری جانب پلٹتے اور بڑے ہی تعریفی ڈھنگ سے فرماتے۔ "بھئی کمال کر دیا۔" وہ اے ایس آئی صاحب جو ہمیں جیپ میں لاد کر لائے تھے کچھ دیر بعد اپنے ہی ایسے ایک اور تھانیدار صاحب کو ساتھ لے کر کمرہ میں داخل ہوئے۔ دونوں حضرات نے پہلے ہماری طرف دیکھا پھر ان یتیم بیہوش لڑکوں کی جانب۔

"پرانی ہڈی ہیں میاں۔ شدھ گھی دودھ کھا پی رکھا ہے۔"

ان حضرات کو سمجھانا فضول سمجھ کر ہم نے چپ رہنے میں ہی مصلحت سمجھی۔ ہمارے ساتھی بزرگ جو حکومت ہند کے ایک بڑے افسر تھے اپنے آپ کو اس مصیبت میں خواہ مخواہ الجھا دینے کے لیے خاصے پشیماں اور شرمندہ تھے۔ مگر وہ بھی سمجھ وہی رہے تھے جو تھانے کے دوسرے حضرات۔

اس بیچ لوگ یکے بعد دیگرے آتے اور ہماری مردانگی، بے پناہ قوت اور طریق جنگ پر ہمیں بے مانگی داد دیتے رہتے۔

"اس عمر میں یہ حال ہے بڑے میاں کا۔ جوانی میں تو باقاعدہ جلاد ہی رہے ہوں گے ایک اور صاحب فرما رہے تھے" یہ ڈالڈا کی اولاد کیا کھا کر پرانی ہڈیوں سے ٹکر لے

گی۔ یہ بھی شکر تھا کہ پولیس والے وقت پر پہنچ گئے ورنہ یہ پانچ چھوکرے تو بس سمجھ لو کہ راہیِ ملک عدم تھے۔"

دوسرے صاحب کہنے لگے "کوئی فوٹو گرافر ہوتا تو موقع پر تو لڑائی کے دو چار فوٹو ہی اتار لیتا۔ یادگار رہ جاتی بڑھاپے کے اس دم خم کی"

اخبار میں دینے لایق خبر ہے۔

"پچاس سالہ بڈھے اور پانچ نوجوان چھوکروں کی لڑائی۔ پانچوں چھوکرے ایک ساتھ چت۔"

ہر آنے والا لہک لہک کر و چہک چہک کر ہماری بے پناہ شجاعت قوت اور دلیری کے قصیدے کہہ رہا تھا جب کہ ہم اپنے درد وں سے نڈھال چپ چاپ مسکین صورت بنائے بیٹھے تھے۔ اور اپنی حماقت کو دل ہی دل میں کوسے جا رہے تھے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ان پانچ نوجوان چھوکروں میں ایک جو باقی سب کی نسبت کسی قدر شریف اور سیدھا دکھائی دے رہا تھا اور بہتر کپڑے بھی پہنے ہوئے تھا، دھیرے سے اٹھ کر ہماری طرف آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے پاؤں سے چمٹ کر زار و قطار رونے لگا۔

"انکل خدارا آپ ہمیں اب کی بار معاف کر دیں۔ آئندہ کبھی ایسی حماقت نہ کریں گے۔ ہم سب بھلے گھروں کے بچے ہیں، ہمارے والدین کو پتہ لگ گیا تو اور بھی بہت برا ہو گا۔ ہمیں تو خیر سزا مل ہی گئی ہے وہ سنیں گے تو اور بھی پشیماں ہوں گے۔

عین اسی وقت ایس ایچ او صاحب علاقہ کے ڈی ایس پی صاحب کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے اور نیا منظر دیکھ کر ایک دم ٹھٹھک گئے۔ پولیس کے بڑے صاحب بہادر کو دیکھ کر باقی کے چاروں شہید بھی اسی طرح آ کر ہمارے پاؤں پر پڑ گئے، اور گڑگڑا کر معافیاں مانگنے لگے

ڈی ایس پی صاحب خدا بھلا کرے ان کا بڑے ہی شریف افسر تھے اور جوں کہ ساری کہانی پہلے ہی سے سن چکے تھے۔ لڑکوں کا اعتراف گناہ جس میں اعتراف شکست تو ظاہر ہے کہ تھا ہی، دیکھ اور سن کر انھیں پورا یقین ہو گیا کہ واقعی ہم پرائز فائٹر ایسی کوئی چیز ہیں اور یہ لڑکے ہمارے ساتھی بزرگ افسر کی رپورٹ کے مطابق نئی بگڑی نسل کے گمراہ چھوکرے ہیں جو بلاوجہ ہم سے الجھ پڑے تھے اور اپنے کئے کی سزا کافی سے زیادہ بھوگ چکے تھے۔

"آپ کو اس سلسلے میں کوئی بیان دینا ہے،" ڈی۔ایس۔پی صاحب نے ہم سے بڑے احترام سے جھجکتے جھجکتے دریافت فرمایا۔

یہ سب اچھے گھروں کے بچے ہیں اور چوں کہ اپنے کئے پر خود ہی پشیماں ہیں ہم ان کے خلاف مزید (ہم نے لفظ مزید پر خاص زور دیا) کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے۔

اس کے بعد ایک فارمل رپورٹ درج کی گئی اور ہماری لڑائی کو ایک معمولی جھگڑا قرار دیتے ہوئے فریقین کے مابین راضی نامہ کرا دیا گیا۔ باہر آکر ہم نے کچھ ڈر سے اور کچھ اپنی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے پانچوں بچوں کو پیار دیا نصیحتیں و دعائیں دیں اور گھر واپس جانے کے لیے پانچ روپے بھی دیے کیوں کہ مار پیٹ کے دوران لوگوں نے ان بیچاروں کی جیبیں بھی خالی کر دی تھیں۔

پولیس کی نظروں میں ہمارا جو امیج بلا وجہ بن گیا تھا ہمیں خود بھی بہت پسند آیا۔ ہمیں یہ جان کر بھی بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارے بزرگ ساتھی بھی جو ہمارے بڑے افسر کے جاننے والے تھے ہمیں ایک باقاعدہ قسم کا ہیرو سمجھ رہے تھے اور ظاہر تھا کہ وہ ان کے سامنے بھی ہماری تعریف کریں گے۔

اس نئے امیج کو بنائے رکھنے کے لیے ہی ہم نے آخری وقت میں مسلمان ہونے کی ٹھانی ہے اور اس بڑھاپے میں یوگ آسن، صبح و شام کی سیر اور کسرت وغیرہ باقاعدگی سے شروع کر دی ہے۔

ہماری بیگم ظاہر ہے آج کل ہم سے دل ہی دل میں بے حد خوش ہیں۔ صحت مند شوہر ایسی کارآمد شے کس عورت کو نہیں بھاتی

مثلث

ہری مندر میں ستھاپت ان مورتیوں کے حضور میں وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔
تین مقدس مورتیاں۔
برہم، شِو وشنو۔ انسانی مقدروں کے دیوتا برہما کے ہاتھ میں تخلیق کی کتاب اور قلم۔ شو کے ہاتھوں میں ان کا جانا پہچانا ترشول اور ڈمرو۔ وشنو کے ہاتھوں میں تیر کمان، سدرشن چکر اور شنکھ۔ ان کا چوتھا ہاتھ جو خالی تھا بھگتوں میں وہ غیر مرئی برکتیں بانٹ رہا تھا جن کو پانے کے لیے وہ دیودرشنوں کو آتے ہیں

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا خدا کون ہے، لہٰذا ہری مندر میں آنے سے پہلے وہ احتیاطاً بڑے گرجا گھر پر سلیب پر ٹنگے کرائسٹ اور مقامی بڑی مسجد کی وسیع و عریض فضا میں مہکتے اللہ پاک کو بھی اپنے ارادے سے مطلع کر آیا تھا۔۔۔۔

اس شہر کے لوگ انھی تین مذاہب سے منسلک تھے۔ وہ جو اپنی ولدیت کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا تھا ظاہر ہے آخری چھلانگ لگانے سے پہلے کسی چوتھی عدالت میں نہ جا سکتا تھا

اسے انصاف کی طلب تھی۔ ایسے انصاف اور ایسی روشنی کی طلب تھی جو صرف خدا کی عدالت میں ملتی ہے۔

خدا کا گھر۔
انصاف کا مندر۔
روشنی کا منبع۔

برہما، شو اور وشنو۔ تین بڑے ستون تین اہم نقطے۔ ہندو دھرم کی مثلث خدا بیٹا اور دی ہولی گھوسٹ، عیسائیت کی تکون اللہ، رسول، اسلام۔

اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ زمین آسمان اور پاتال۔ آدمی کے خوابوں کی تین آخری حدیں۔ خشکی، تری اور ہوا، زندگی کے تین ضروری اجزا۔ سرخ نیلا اور پیلا، قوس وقزح یعنی حسن کے تین بنیادی رنگ۔ تین پتی، تین پانسے۔

وہ زندگی کی بازی ہار گیا تھا اور وہ مثلث جس کا وہ کبھی خود بھی ایک اہم زاویہ تھا ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اس کا وجود اب اس اکیلے نقطے کی مانند تھا جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ صفر زیرو۔ شونیہ۔ یعنی کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

کبھی اس کی بھی ایک دنیا تھی۔ ایک مکمل متساوی الاضلاع مثلث، مگر آج اس تکون کے دوسرے دو نقطے کہیں کھو گئے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ اکیلا بھی اکائی ہوتا ہے، مگر وہ تو صفر تھا صفر یعنی زیرو یعنی شونیہ۔ یعنی کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

نقطے تو گئے ہی تھے، اپنے ساتھ زاویے اور لکیریں بھی لے گئے۔ مثلث کٹ کر گر گیا، ٹوٹ گیا۔

"اب میرے وجود کا کیا مطلب ہے؟ کیا مقصد ہے؟ میں کیا ہوں۔ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ صفر۔ زیرو۔ شونیہ۔"

"میں تم سے اجازت لینے آیا ہوں"، وہ وشنو بھگوان کے مہرباں اور مسکراتے ہوئے چہرہ سے مخاطب تھا۔

"تم سب جانتے ہو۔ اب جب کہ میرا کوئی مصرف نہیں تو پھر تمہارے پاس خود اپنے آپ چلے آنے میں کیا قباحت ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی خوشی کے لیے۔ اس خوشی کے لیے مر رہا ہوں جو تم نے چھین لی ہے۔ میری موت کو خودکشی کہہ کر تم آدمی کے بتائے ہوئے بے رحم قانون سے۔ بغاوت کے جرم میں مجھے مزید اذیت بھی پہنچا سکتے ہو۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو اور غالباً کرو گے بھی۔ مگر جو تمہارا قانون ہے اس کے مطابق میں اپنے دیراگیہ کے بل پر جنم مرن سے آزاد ہونے یعنی نروان پانے کا حقدار ہوں ـــــ تمہاری دی ہوئی یہ زندگی اتنی الجھی ہوئی ہے کہ میرے ایسا آدمی اس میں زندوں کی طرح نہیں جی سکتا۔ میری خودکشی خود مختاری کا اعلانیہ نہیں۔ زندگی سے نجات پانے کی ایک ادنیٰ کوشش ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم بڑے شریر ہو

اور میری ہر ایسی کوشش کو بیکار بھی کر سکتے ہو۔ خدا بخش بے چارہ مسجد کی سب سے اونچی محراب سے چھلانگ لگا کر بھی زندہ ہے۔ کتنے ہی لوگ ریل گاڑی کے نیچے کچلے جا کر بھی نہیں مرے۔ بس اپاہج ہو گئے اور اسی حال میں سالہا سال جئے۔ مگر میں اس طرح جینا نہیں چاہتا۔ میں تم سے موت کی بھیک مانگتا ہوں۔ کیوں کہ بے مقصد و بے مطلب جینا اور دھرتی کا بوجھ بنے رہنا مجھے اب اچھا نہیں لگتا۔ میری رہنمائی کرو۔ جیسے میری زندگی کی تکون توڑی ہے، اسی طرح مجھے بھی توڑ دو"

مگر بھگوان مسکراتے رہے۔

"میں تمہاری اس اشتہاری مسکراہٹ کا کیا مطلب سمجھوں؟

مگر بھگوان نے کوئی جواب نہیں دیا اسی طرح اپنی رحیمانہ مسکراہٹ کی روشنی بکھیرتے رہے۔

بہت عرصہ تک یوں ہی کھڑے کھڑے جب وہ تھک گیا تو مندر کے ستون سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

"آج تو میں فیصلہ کر کے ہی جاؤں گا"

بیٹھے بیٹھے اس کے بے چین من کو تھوڑی شانتی اور اس کے تھکے ہوئے اعضا کو تھوڑا آرام ملا۔ پجاری کے منتروں سے اس کے منتشر دل و دماغ کو ماں کی لوری کا سا آبھاس ہوا اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ سو گیا۔ کتنی ہی دیر اس کا بدن مندر کے اس ستون سے سکون پاتا رہا ——————

جب وہ جاگا تو شام ہو چلی تھی، اسے دیوتا سے اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملا تھا۔ کوئی ڈھارس نہ ملی تھی۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی اب لوٹ جائے گا۔ وہ دنیا میں اکیلا ہے۔ اس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو پھر مرنے کے لیے اسے دیوتا کی اجازت کی ایسی کون سی ضرورت ہے۔ ایکا ایک اسے لگا کہ وہ ایک بہادر یودھا ہے اور اس کے بدن میں بھیم کی طرح سو ہاتھیوں کا بل ہے۔ جس نے موت کے خوف سے چھٹکارہ پالیا اس سے بڑا بلوان کون ہو سکتا ہے۔؟

اس نے تینوں بے جان مورتیوں پر رحم بھری آخری نگاہ ڈالی اور باہر نکل آیا۔

بھگوان کیا ہے ؟

ایک متھیہ، چھلاوا، کمزوروں کا سہارا، زخمیوں کا مرہم، آدمی کے اختراعی ذہن کی ——— ایک فرسودہ ایجاد

"میں کمزور نہیں، زخمی بھی نہیں، وہی بھاگے ان سایوں کے پیچھے جو موت کے خوف سے ہراساں ہو یا جسے کوئی دنیاوی طلب ہو۔ میں کیوں بھاگوں؟"

ایکا ایک وہ بلند آواز سے چلّایا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا"

شام کو مندر میں آنے جانے والے بھگت لوگ اس کے اس بلند اعلان کو سن کر ٹھٹھک گئے۔ جو کمزور تھے پرے ہٹ گئے، جو کمزور نہیں تھے انھوں نے اسے پاگل سمجھ کر راستہ دے دیا۔

اب وہ بستی کو لوٹ رہا تھا۔ چلتے چلتے اسے لگا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہی آوارہ کتا تھا جو پچھلے چند روز سے اس کے ساتھ سائے کی طرح چمٹا ہوا تھا۔

اس نے بڑے پیار سے مسکرا کر کتے کی طرف دیکھا

"میں یدھشٹر نہیں ہوں دھرم راج جو تمہیں بیکنٹھ لے چلوں گا۔ وہاں تو مجھے اکیلے ہی جانا ہے وہ سورگ ہے یا نرک ——— مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں

وہ رکا تو کتا بھی رک گیا۔ اس نے چند قدم بڑھائے، کتا بھی چلنے لگا اتنی ہی دوری پر جتنی ان دونوں کے درمیان پہلے تھی۔ وہ پھر رک گیا۔

"تو تم نے جان لیا ہے کہ میں مرنے جا رہا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ بننا چاہتے ہو۔ مگر گواہی تم کسے دوگے۔ کون سمجھے گا تمہاری زبان؟

کتا کھڑے کھڑے دم ہلا رہا تھا اور بھری بھری ملایم آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اس نے لوٹ کر کتے کے بدن کو بڑی شفقت سے سہلایا۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے دیکھا کہ کتے نے بڑے اطمینان سے آنکھیں میچ لی ہیں اور ایک انوکھی چاہت سے اس کی دم ہل رہی ہے۔

"تم میرے کون ہوتے ہو بھائی، جاؤ اپنا راستہ ناپو"

کتے نے سر ہلا کر جانے سے انکار کر دیا، تو وہ بھی مسکرا دیا۔

"تم کس مٹی کے بنے ہو میاں کون ذات ہو۔ مگر ذات تو آدمی کی ہوتی ہے۔ میری اپنی کوئی ذات نہیں تو کیا ـــــ میرا نام تو ہے، تمہارا تو نام بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ تم بھی میری ہی طرح کوئی مجہول النسل چیز ہو۔ مجھے ایک غریب مزدور نے اسی ہری مندر کی دہلیز پر پڑے پایا تھا، لہٰذا اس نے میرا نام رام کرشن رکھ دیا ـــــ رام کرشن ایک غریب مزدور کے لڑکے کا نام ہی ہو سکتا ہے۔ آج کل کون اپنی چہیتی اولاد کو ایسے پرانے نام دیتا ہے ـــــ منوج، پنکج، دلیپ، راج، دیو، اشوک، وِنے، وویک یہ تو نام ہوئے نہ، رام کرشن بھی کوئی نام ہے۔ بابا مجھے رام کسن کہہ کر بلاتے تھے ان کا خیال تھا کہ میرے نام میں دیوتاؤں کے منتروں کی دھن ہے۔ مجھے دن میں دس میں بار پکار کر وہ دیوتاؤں کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ انھیں عاقبت سدھارنے اور پربھو دھام جانے کا بڑا شوق تھا ـــــ

"بابا بھی کیا چیز تھے۔ چوروں کے کارخانے میں پورے چالیس سال ملازمت کرنے کے باوجود چور نہ بنے۔ انھوں نے کیسے مجھے لکھایا پڑھایا اور بی اے پاس کرا کر مل کے بڑے بابو کی لڑکی سے میری شادی بھی کرا دی۔ بابا اماں اور میں یہ میری زندگی کا پہلا مثلث تھا بابا گئے تو ستی سادھوی ماں نے بھی دیہہ تیاگ دیا۔ زندگی کا دوسرا مثلث تھا۔ میری بیوی رانی، میں اور ہمارا چاند ایسا بیٹا راجا۔ پہلا مثلث ٹوٹا تو دوسرا بن گیا۔ اب دوسرا بھی ٹوٹ گیا ہے مگر یہ سب میں تمہیں کیوں بتا رہا ہوں۔ تم اس طرح دُم ہلا رہے ہو اس طرح من لگا کر میری گاتھا سن رہے ہو، جیسے سب سمجھتے ہو۔ دھرم راج ہو نا۔ مگر پربھو میں یدھشٹر نہیں ہوں۔ تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔ خود میرے پاس جب کچھ نہیں ہے تو تمہیں کہاں سے کھلاؤں گا ـــــ پھر ـــــ میں تو مرنے جا رہا ہوں"

جب اس نے دیکھا کہ اس کے پیار، دلار بلکہ دُھتکارنے کے باوجود کتا نہیں گیا تو اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کا خیال چھوڑ دے اور چلا چلے جہاں اسے جانا ہے۔

مگر اسے کہاں جانا ہے۔ مرنے کے لیے لوگ کہاں جاتے ہیں۔ ریل کی پٹری، کسی بڑی عمارت کی سب سے اونچی منزل۔ تیز و تند دریا۔ گہرا سمندر۔ تیز طرار چھرا۔ بندوق کی گولی زہر کی پڑیا ـــــ وہ اسی ادھیڑ بن میں گم کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے اوپر سے کوئی نرم سی شے چپکے سے گزر گئی۔ یہ ایک کالے رنگ کا بڑا ہی ڈراؤنا سانپ تھا۔

کتا سانپ کو دیکھ کر زور سے بھونکا اور پھر حملہ کی غرض سے اس کی جانب لپکا

بھی مگر سانپ اتنے میں قریب ہی کی کسی جھاڑی جا چھپا تھا۔

موت کتنی قریب آئی تھی مگر کیسے چپکے سے سرک گئی گویا کہہ رہی ہو، ہر کسی کے مرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ وہ وقت ابھی نہیں آیا۔ کتا آ کر اس کے پاؤں کے اس حصہ کو چاٹنے لگا جس پر سے سانپ ابھی ابھی رینگ کر گیا تھا۔

وہ مسکرایا "نہیں نہیں مرے دوست، اس نے مجھے نہیں کاٹا۔ وہ کوئی سانپ تھوڑے ہی تھا وہ تو اشارہ تھا قدرت کا کہ مجھے ابھی کچھ دیر اور جینا ہے۔ تو کون ہے میں نہیں جانتا۔ میں تو اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ میں کون ہوں۔ رام کرشن، مگر کیا نام ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بابا، اماں، رانی، راجہ سب مر گئے۔ ایک ہی سال میں زندگی کے سارے نشان سارے نقطے اور زاویے مٹ گئے، مگر میں زندہ ہوں اور یہ سانپ ابھی ابھی بتا گیا ہے کہ مجھے ابھی اور جینا ہے ——

کتا دم ہلا کر اس کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ ایک بار۔ دو بار۔ تین بار۔ چار بار۔

"ہم نے بھی چار بار اگنی کے گرد گھوم کر پھیرے لیے تھے اور وعدے کئے تھے کہ ہم ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ بڑے اہتمام سے اپنی زندگی کا دوسرا مثلث مکمل کیا تھا۔ مگر وہ بھی ٹوٹ گیا۔ پہلے چھوٹا نقطہ ٹوٹا پھر بڑا اور پھر —— میں اکیلا ہو گیا —— آدمی بڑا بے حیا ہوتا ہے —— میرا سب کچھ چلا گیا، مگر میں اب بھی زندہ ہوں ——

اب تم ساتھ دینے کے لیے تیار ہوئے ہو تو بھی مجھے خوف ہو رہا ہے کہ ان کی طرح تم بھی۔"

کتے نے گردن جھٹک کر یقین دلایا کہ وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔

مقدس جانور ——

"میں بڑا منحوس ہوں دوست!"

اور تب اچانک ہی اس نے اسے دیکھا —— وہ درخت کے نیچے تنے کے سہارے گٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ چھوٹی سی۔ معصوم بچی ایسی

"تم کون ہو؟"

"تم کون ہو؟" لڑکی نے دہرایا۔ آواز میں بجلی ایسی کڑک تھی۔

"میں" وہ سوچ میں گم ہوگیا۔ وہ کہہ سکتا ہے وہ رام کسن ہے مگر یہ بھی کوئی تعارف ہے۔ نام تعارف تو نہیں ہوتا، بس نام ہوتا ہے اس سے تو صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مرد ہے۔ جواب نہ پاکر لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں تمہیں جانتی ہوں!"

"تم مجھے جانتی ہو؟"

تم ایک پاگل ہو۔ میری ماں کی طرح۔ تم کتے سے باتیں کرتے ہو۔ وہ ہر چرند پرند سے گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے۔ جو آدمی کی زبان نہیں سمجھتے ان سے وہی باتیں کرتے ہیں جو حواس باختہ ہوں۔"

"کہاں رہتی ہو؟"

لڑکی نے قریب کے ایک کھنڈر کی طرف اشارہ کیا "وہاں"

"وہ تو کھنڈر ہے۔"

"میں تمہیں کوئی شہزادی دکھائی دیتی ہوں؟"

"تمہارا نام؟"

"عائشہ"

"تمہارے ابا، امی۔"

"ابا نہیں صرف امی۔ وہ بھی اب نہیں کے برابر ہے کیوں کہ پاگل ہے۔"

"تم ادھر اندھیرے میں بیٹھی ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔"

"ڈر انھیں لگتا ہے جنہیں موت کا خوف ہوتا ہے میں ادھر اس لیے بیٹھی ہوں کہ اس جھاڑی کا کالا ناگ مجھے اپنی خلوت میں مخل ہونے سے ناراض ہوکر ڈس لے اور میں ایک دم مرجاؤں۔"

"تم تو ——— ابھی!"

"جوان ہوں۔ اسی لیے تو مرنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے کالے ناگ کا کاٹا پانی تک نہیں مانگتا۔ یوں تل تل مرنے سے ایک دم مرجانا کیا بہتر نہیں"

"تم مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو گی"

کابوس

جنوری ۱۹۴۰ء، اماوس کی رات، گہرا خاموش اندھیرا۔

نیند انسان اور کائنات کی ہر چیز پر طاری ہوتی جا رہی ہے۔ لمبی چوڑی سڑکوں اور گلیوں میں میونسپلٹی کی روشنیاں تک اونگھتی سی دکھائی دیتی ہیں۔ جنوری کے کہرے نے انھیں کچھ ایسے دھندلا رکھا ہے گویا وہ بجلی کے قمقمے نہ ہو کر مٹی کے بے سہارا دیے ہوں یا ہوا میں لرزتی کانپتی نحیف و لاغر موم بتیاں۔

فضا میں اِن روشنیوں کے ٹمٹماتے جگنوؤں اور بمبئی کی بڑی بڑی فلک شگاف عمارتوں کے علاوہ جو اِس آدھی اندھیری رات میں بھی خاصی آب و تاب سے جگمگا رہی ہیں، زندگی کا کہیں کوئی نشان نہیں۔

جنوری کی یہ خنکی، آدھی رات، سناٹا اور دور سمندر کی مدہوش لہروں کی دھیمی دھیمی لوریوں ایسی آواز۔

نیند عمارتوں کے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ اس قبرستان ایسے بے آواز ماحول میں کہیں کوئی شور یا ہلچل ہے تو نیند کے خراٹوں میں ان پر تکلف عمارتوں کے گورکھے اور پٹھان رکھوالوں اور گشتی پولیس کے سپاہیوں کو بھی نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

شانتی سوچ رہا ہے، خدا کا شکر ہے کہ بمبئی میں جنوری کے موسم میں بھی

"کون ایسی دور ہے۔ خود ہی چلے جاؤ نا ـــــ مگر وہ تم سے بات نہیں کرے گی"

"کیوں؟"

"کیوں کہ تم آدمی ہو، ایک مرد ہو، اور مردوں سے اسے نفرت ہے"

"وجہ؟"

"میرا باپ"

"کہاں ہے تمہارا باپ؟"

"کہا نا کہ نہیں ہے۔ مر گیا کمبخت۔ اچھا ہی ہوا کہ اپنے آپ مر گیا ورنہ اس کا خون میرے سر لگتا۔ بڑا ظالم تھا۔ ہر شب شراب پی کر ہم دونوں کو پیٹتا تھا۔"

"تمہاری کہانی ذرا مختلف ہے مگر میری اپنی کہانی کی طرح ہی دردناک ہے۔ مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو۔"

لڑکی پھر ہنسی "اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے نا۔ پاگل عورت ہے جانے کیا کر بیٹھے۔"

"ڈر مجھے بھی نہیں لگتا کیوں کہ تمہاری طرح میں بھی موت سے نہیں ڈرتا۔" پھر جیسے کتے کو ساکھشی بناتے ہوئے اس نے کہا۔ "کیوں مولا بخش ٹھیک کہتا ہوں نہ میں"

"مولا بخش؟ تمہارے کتے کا نام مولا بخش ہے؟"

"یہ کتا میرا نہیں اور دیکھا جائے تو ہے بھی۔ ابھی ابھی بخشا ہے مولا نے، سو میں نے اسے مولا بخش کہہ دیا۔"

"میری ماں کے سامنے کتے کو نہ بلانا۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب ہے میری ماں کے سامنے یہ نام نہ لینا"

"کیوں؟"

"مولا بخش میرے باپ کا نام تھا۔"

"تو تم لوگ مسلمان ہو۔"

"عائشہ کیا کسی ہندو لڑکی کا نام بھی ہو سکتا ہے؟"

"آج کل سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میرے مرحوم باپ کے ہندو کارخانہ دار کی بیٹی کا نام گل بدن تھا جب کہ وہ کوئلے کی طرح سیاہ فام تھی۔ آج کل ناموں سے آدمی کا مذہب

یا ذات نہیں پہچانی جا سکتی ۔۔

"تم مسلمان نہیں ہو ؟"

"کون جانے ۔"

"تم نہیں جانتے ؟ ۔۔

"نہیں "

"پھر اپنے کتے کو مسلمانی نام کیوں دیا ہے تم نے ؟"

"مولا بخش مسلمانی نام ہے یہ میں نے نہ سوچا تھا۔ تم نے کہا تمہارا نام عائشہ ہے۔ پہلے میں سمجھا تمہارا نام آشا ہے، آشا یعنی امید، مگر تمہارا تلفظ بڑا صاف ہے ۔ تمہارا نام سن کر میرا رام رحیم بن گیا اور کتے کو رام دتا یعنی رام کا دیا ہوا کہنے کی بجائے میں نے مولا کا دیا ہوا یعنی مولا بخش کہہ دیا ۔"

"تمہارا ذہن خاصا تیکھا ہے، بہت تیزی سے سوچتا ہے ۔ تم دل چسپ آدمی ہو۔"

"میں آدمی کہاں ہوں عائشہ ۔ میں تو ایک لاش ہوں ۔ اپنے ماضی کا بھوت"۔

"تم بڑے اچھے بھوت ہو ۔ چلو تمہیں ماں کے پاس لے چلوں ۔ اسے زندوں کی نسبت بھوت اچھے لگتے ہیں ۔"

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی ۔ جسے اس نے پہلے ایک چھوٹی سی بچی سمجھا تھا وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی ۔ پھٹے حال ہوتے ہوئے بھی اس کے بدن سے زندگی کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف بکھر رہی تھیں ۔

"چلو مولا بخش ـــــ"

اور وہ تینوں کھنڈر کی طرف چل دیئے ۔ اس نے سوچا ایک نئی تکون ابھر رہی ہے، تیسری تکون ۔ ایک اجنبی نوجوان عورت ، وہ خود اور مولا بخش کیا زندگی لوٹ رہی ہے ـــــ ایکا ایک اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام عائشہ ہے نا، اور تمہارے ابا کا نام مولا بخش"

"مولا بخش مرحوم ـــــ"

ہاں مرحوم ۔ اور تم بھی مرنا چاہتی ہو اور تمہاری ماں انسان کی نسبت چرند پرند سے ہم کلام رہنے کو ترجیح دیتی ہے !!

"میں نے انسان کی بات کب کی۔ میں نے تو آدمی یعنی مرد کی بات کی تھی۔ تم کیا آدمی اور انسان کے فرق کو نہیں سمجھتے۔"

"تم تو سمجھتی ہو؟ پڑھی لکھی ہو نا!"

"اس میں کیا شک ہے، دسویں پاس ہوں" لڑکی نے بڑے فخر سے بتایا پھر کتے کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔ "آپ تو ظاہر ہے کہ بے نسلے ہیں اور کوئی ایسے پڑھے لکھے بھی نہیں"

"میں بی اے پاس ہوں۔"

"میں ابا جان سے ہم کلام تھی تم سے نہیں۔ تم تو ظاہر ہے کہ خاصے پڑھے لکھے ہو"

"تم بڑی عجیب لڑکی ہو!"

"ہاں نا۔ وہ سب مجھے عجیب و غریب شے کہتے تھے"

"وہ کون!"

"کالا آصف، میرا عاشق اور میری سہیلیاں۔"

"آصف کہاں ہے؟"

"اسے ابا جان نے کاٹ کھایا۔ ابا کو باولے کتے نے کاٹا تھا، ابا نے اسے کاٹ لیا اور اتنے زور سے کہ دونوں ایک ساتھ مرے۔ "خس کم جہاں پاک"

کھنڈر کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھی وہ ایک ٹک نیلے آسمان پر بکھرے ہیرے موتیوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ انھیں آتا دیکھ کر بپھری۔

"تو پھر کسی کو لے آئی ہے گشتی؟"

"نانا اماں۔ کنواری بیٹی کو گشتی نہیں کہتے!"

"تو پھر یہ کون ہے؟"

"ایک نایاب چیز ——— انسان"

"یہ اس کے ساتھ کیا ہے۔"

"یہ ہیں تمہارے مرحوم شوہر مولا بخش۔ میرے ابا جان"

"یہ تو ایک بے نسلی کتا ہے ری"

"تمہارا شوہر کیا کسی بڑی نسل کا کتا تھا؟"

بیٹی کا جواب سن کر عورت مسکرائی۔ اندھیرے بھی اس کے سفید دانت چمک رہے تھے،
"یہ مرد ـــــ تو نے کیسے جانا کہ یہ انسان ہے"
"مجھے دیکھ کر اس کی نگاہوں میں ہوس کی وہ لَو نہ چمکی تھی جو ہر آدمی کی آنکھ میں ہر خوب صورت اور نوجوان لڑکی کو اکیلی اور بے سہارا دیکھ کر اپنے آپ ـــــ"
"تیرا نام؟"
"رام کسن ـــــ یعنی رام کرشن"
"تو تو کافر ہے؟"
"تم مومن ہو تو میں ضرور کافر ہوں"
عورت بولی۔ "مجھے اپنے ماں باپ کا کچھ علم نہیں۔ مجھے مولا بخش یعنی اس کے باپ نے مسجد کی سیڑھیوں پر پڑا پایا تھا۔ بیٹی کی طرح پالا مگر جیسے ہی میں جوان ہوئی۔ ابھی جوان بھی کہاں ہوئی تھی رے"
"پھر وہی پرانی کہانی"۔ لڑکی نے ماں کو ڈانٹا، مگر عورت کہتی گئی۔ "تو اس نے مجھے اپنی داشتہ بنالیا۔ یہ لڑکی حرام کی اولاد ہے ـــــ"
"حرام کی کیوں"۔ لڑکی احتجاجاً چیخی۔ میں کیسا ابا کی بیٹی نہیں،
"میں بھی تو اس کتے کی بیٹی تھی۔ میری کیسا اس سے شادی ہوئی تھی ری۔ بغیر نکاح جنمی دوزخی، تو حرام کی اولاد نہ ہوئی تو کیا حلال کی ہوئی۔ وہ تو شکر کر کہ تیرے جوان ہونے سے پہلے ہی وہ "حرام زادہ"
"تو، تو بازاری عورتوں کی طرح گالیاں بکتی ہے"
"تو کیا میں گھر کی عورت ہوں رہی۔ بازاری عورت اور کیا ہوتی ہے۔ تیرا باپ بازاری مرد تھا۔ آوارہ مجہول النسل کتا، ورنہ کون اپنی منھ بولی بیٹی سے۔"
"اب اس لمبی تمہید اور اس تعارف کے بعد کون اپنائے گا تیری بیٹی کو۔"
رام کرشن کے منھ سے اچانک نکل پڑا "میں اپناؤں گا تیری بیٹی کو اماں!"
"اماں!! ارے تو نے مجھے اماں کہا۔ سن رہی ہو منیا۔ سن رہے ہو میاں مٹھو، اس انسان کے بچے نے مجھے۔ مولا بخش کی رکھیل کو اماں کہا ہے۔ تو جانتا ہے رے اس کا مطلب؟"
"مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ میں جو دو ماؤں کا حرامی بیٹا ہوں، ایک کا نام دیو کی

یا کوشلیا تھا دوسری کا یشودھا۔ ایک نے جن کر مندر کی دہلیز پر چھوڑ دیا دوسری نے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اب دونوں ہی نہیں ہیں۔"

"میں تو ہوں رے، میں تیری اماں ہوں۔ مگر تو بہت دیر سے آیا عورت نے قریب مرے ہوئے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے مار ڈالا مگر اس سے ڈسے جانے کے بعد۔ اس کا زہر میرے بدن میں سرایت کر چکا ہے اور ہولے ہولے ــــ" وہ چپ ہو گئی ایکا ایک اس نے ایک ہچکی لی اور ــــــ"

"یہ وہی سانپ ہے جس کی مجھے کئی دنوں سے تلاش تھی"۔ لڑکی بولی

"یہ وہی سانپ ہے جو میرے ننگے پاؤں کے اوپر سے ایسے رینگ گیا تھا گویا وہ کسی آدمی کے پاؤں نہ ہوں۔ راستے کے بے جان پتھر ہوں"

بے جان! اس نے مجھے کاٹا نہ تجھے جب کہ ہم دونوں کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس نے ماں کو کاٹ لیا۔ جس کا مرنے کا ابھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ مگر جسے اب مر ہی جانا چاہیئے تھا"

"تمہاری ماں بہادر تھی۔ مری، مگر دشمن کو مار کر ــــــ"

"وہ بہادر ہوتی تو کیسا پیدا ہوتی میں ــــ وہ بہادر نہ تھی اسی لیے میں وجود میں آئی۔ میں اس کی بزدلی، اس کی کمزوری، اس کی بے حیائی کی نشانی ہوں"

"ہم دونوں کی ایک ہی کہانی ہے۔"

"کتا اب ان دونوں کے قریب آ گیا تھا اور باری باری دونوں کے ہاتھ پاؤں چاٹ رہا تھا۔ رام کرشن نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ہماری ہستی کے بکھرے اجزا جوڑ رہا ہے ــــ خدا کا قاضی ــ بھگوان کا پنڈت ــــ گرجے کا پادری"

"مگر؟"

"مگر کیا!"

"میں تو کچھ نہیں ہوں۔ ایک یتیم بے سہارا غریب لڑکی۔ ایک صفر۔"

"میں خود بھی ایک صفر تھا مگر اب ایک اکائی بن گیا ہوں۔ تم میرے دائیں آ جاؤ۔ اکائی اور صفر مل کر دس ہو جائیں گے۔"

"میں ایسے ہی یہیں کھڑی رہوں تو"

"تب تو میں اکائی ہی رہوں گا اور تم صفر"

"تو پھر مجھے تمہارے دائیں ہی رہنا چاہیئے۔ میں بھی اب صفر بن کر جینا نہیں چاہتی"

"میں آج مرنے کے ارادہ سے نکلا تھا، بھگوان سے اجازت بھی مانگی تھی مگر اس نے میری رہنمائی نہ کی، الٹے دکھا دیئے۔ سدرشن چکر، تیر کمان، شنکھ، ترشول، کتاب اور قلم"

"تم ہندو لوگ بڑے سیانے ہوتے ہو۔ شنکھ موسیقی اور انبساط کا سمبل ہے، کتاب اور قلم تخلیق کے اور سدرشن چکر، ترشول اور تیر کمان مرد کی طرح جینے کے۔ تم مورتیوں سے زندگی کا درس لیتے ہو جب کہ ہم مورتی پوجا کو کفر سمجھتے ہیں۔

"اقلیدس کیا مورتی نہیں؟"

"سیدھی لکیریں گولائیاں اور زاویے مورتی نہیں ہوتے"

"گولائیوں اور زاویوں کا گیان نہ ہو تو مورتی کہاں بنتی ہے"

"ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے میں میں اور تم تم ہی رہو اور ہم؟"

"یہ ممکن نہیں!"

"تو پھر؟"

"ایک راستہ ہے۔ نہ تم تم رہو نہ میں میں رہوں۔ میرا مطلب ہے تم عائشہ تو رہو اور میں بھی رام کشن ہی رہوں مگر نہ تم مومن رہو نہ میں کافر نہ میں ہندو رہوں نہ تم ملیچھ"

"ہم دونوں تو یوں بھی کچھ نہیں ہیں۔ حرامیوں کی نسل نہیں ہوتی، مذہب نہیں ہوتا، دھرم نہیں ہوتا۔ حرامی صرف مرد اور عورت ہوتے ہیں ——— مگر وہ مسکرائی "حرامی ہوتے بڑے اچھے ہیں ———"

"خدا نے جب مرد اور عورت کی تخلیق کی تھی تو اس کا بھی غالباً کچھ ایسا ہی ارادہ تھا، شادی بیاہ، نکاح۔ یہ اُسی افعی کے پھیلائے ہوئے زہر ہیں، جس نے آدم اور حوا کو بے آبرو کر کے باغ عدن سے باہر پھنکوایا تھا۔"

"تمہیں وہ پرانی کہانی یاد ہے۔"

"کہانی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ پھر اپنی زلت کی کہانی کسے بھولتی ہے۔"

"حیرت ہے کہ چرند پرند اور درند تو سمجھ گئے یہ کہانی۔ نہیں سمجھا تو وہی نہ سمجھا جسے خدا نے اپنے ایج پر گھڑا تھا وہ اشرف المخلوقات تو ہے مگر اپنی ذات کو حصاروں میں اسیر کیے بغیر اسے

چین نہیں پڑتا___ کھلی فضا میں اس کا دم گھٹتا ہے ___ بھیرو سماج کا بندر ___،،

"آدمی فطرتاً لالچی، کمینہ اور کمزور ہے ،،

"اس کے برعکس حرامی ہونا کتنا دل فریب ہے ۔ حرامی اکثر بڑے آدمی ہوتے ہیں ۔ جیسے سکندر ، پانڈو، مہان یودھا کرن اور ہماری صدی کا وہ عظیم آدمی آئن اسٹائن ،،

"مرحبا ۔ کیا منظر ہے ۔ چاند نے اُبھر کر اوپر اُٹھ کر اپنی پوری گولائی کو پالیا ہے اور اب کیسی مہربان روشنی پھیلا رہا ہے فضا میں ، یہ طوطا یہ مینا ۔ میرے ابا جان ۔ یہ شکستہ و ویران کھنڈر کسی بے نام حکمراں کا باڑا ۔ ایک مردہ عورت ، ایک مرا ہوا سانپ ___،، کتا اب بھاگ بھاگ کر دونوں کے گرد چکر لگا رہا تھا ۔

"دیکھ رہے ہو تم ۔ ابا میاں کتنے خوش ہیں ،،

"حیرت ہے کہ تمہیں اپنی جننی کی موت کا کوئی غم نہیں ،،

"وہ بزدل کی طرح بلاوجہ ایک طویل زندگی جی ___ مگر ایک بہادر کی طرح دشمن کی سے لڑکر اسے مار کر مری ۔ وہ جو موت کے سامنے سرنگوں نہ ہوئی اس کے لیے روتے نہیں ، فخر و احترام سے مُسکراتے ہیں ،،

"میں بھی سوچتا ہوں موت جب آزادی بن کر آئے تو اس کا خیر مقدم ہی کرنا چاہیئے ، میں نے مرنے کا طے کیا تھا تو سمجھا تھا کہ میں ایک بے خوف اور طاقت ور انسان ہوں اب جینے کا منصوبہ بنا رہا ہوں تب بھی اپنے آپ میں وہی حوصلہ وہی طاقت محسوس کر رہا ہوں ۔ یہ کیسی عجیب کیفیت ہے ___،،

"تم ایک بہادر عورت کی بہادر بیٹی کو اپنا رہے ہو ۔ ایک مرد ایک عورت کی ذات اور مان مریادہ جانے بغیر اسے سماجی کسوٹیوں پر جانچے پرکھے بغیر ،،

"آج میں واقعی بہت خوش ہوں ۔ میں جینا چاہتا ہوں ،،

"موت کے دروازے سے لوٹا ہوا ہر آدمی جینا چاہتا ہے ___ میں بھی جینا چاہتی ہوں ، صفر بن کر نہیں تمہارے ساتھ مل کر صفر سے دس بن کر ___ یہی وہ لمحہ ہے جو ہمیں ایک سے دس بنا سکتا ہے ۔ تم ہو ___ میں ہوں ___ ابا میاں ہیں ۔ مثلث مکمل ہے ۔ مگر دونوں نے دیکھا ۔ مولا بخش وہاں نہیں تھا ایکا ایک نجانے کہاں ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا ۔

ہائی پوکونڈریاسس

"سلطان صاحب آپ بڑے گاؤدی ہیں، اب یہ سالن کیا آپ کے ابا مرحوم کھائیں گے کمبخت زہر ہو رہا ہے۔"

سلطان میاں چپ چاپ کمرے کے کونے میں کھڑے رضا بھائی کی گالیاں سُن رہے تھے۔ بیچارے کہتے بھی کیا، حرکت ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی ان سے۔

"لے چھوڑ غصّہ اور کھا موتی چور کے یہ لڈو۔ جب تقدیر میں لڈو لکھے ہوں میاں تو سالن سالا کیا کرے گا۔"

"تو ہر بڑی بات کو سکیڑ کر چھوٹی اور غیر اہم بنا دیتا ہے۔ تیری یہ حرکت مجھے قطعی نہیں بھاتی۔ کل دوپہر سے میں نے ڈھنگ کا کچھ نہیں کھایا۔ اللہ قسم رات بھر کام میں مصروف رہا۔ صبح ناشتہ کے لیے آنجناب مرغ بھون رہے تھے۔ چنداں چاہتے ہوئے بھی چائے کے ساتھ ہم نے کچھ نہ لیا۔ مبادا مرغ کے ساتھ ناانصافی ہو جائے اور مرغ پکا ہے تو ــــ"

"بھئی ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"تو خود ہی چکھ کر دیکھ لے نہ۔"

"ارے تھوک غصّہ یار میرے اور چل میرے ساتھ آج شیرِ پنجاب میں مرغ مسلّم کھلاتا ہوں اس نمک بھرے مرغ کا بھی کچھ کریں گے، مگر بعد میں۔"

"تو میرا ایمان خراب کرنا چاہتا ہے؟"

"اتنا کمزور ہے تیرا ایمان جو ایک اچھے بھلے سکھ کے ہاتھ کا کاٹا اور پکا مرغ کھانے سے ہی متزلزل ہو جائے گا۔ میں روز تیرا گوشت کھاتا ہوں۔ میرے ایمان کا تو کچھ نہ بگڑا۔"

میرا گوشت تو کیوں کھائے گا کمبخت ـــــ مگر تو تو کافر ہے۔

علی رضا کا غصّہ کافور ہو چکا تھا۔ لڈو منہ میں ڈالتے ہوئے سلطان میاں کی طرف دیکھ کر مسکرائے ـــــ "ایکٹر بننے آئے تھے بمبئی میں، بیچارے کوئی خاندانی باورچی تھوڑے ہی ہیں۔"

سلطان نے بتیسی نکالی۔ اچھا خاصہ وِلن بننے کی صلاحیت تھی اس کے چہرے میں۔ آواز بھی ماشاء اللہ خاصی مردانہ تھی۔

"اب آپ کی سزا یہی ہے کہ لڈو چباتے چباتے دفع ہو جائیں اور سیدھے سینٹرل سٹیڈیو پہنچیں اور وہاں منیر میاں کا پکا ہوا مردہ کتوں کا چمڑہ کھائیں۔"

سلطان کی جان میں جان آئی، بڑی مسکین ادا سے ذرا اور کھل کر مسکرائے۔ چلنے ہی لگے تھے کہ رضا نے حکم فرمایا: "یہ میرا دس سیر کا بستہ بھی اٹھا کر لے جائیں۔ میں کافر ہونے جا رہا ہوں۔"

☆ ☆ ☆

اس روز دوپہر دو ڈھائی کے قریب ہم بیلا ڈپیئر لوٹے تو دیکھا کہ علی رضا کا وہ ایک ہی کمرہ والا فلیٹ مقفل ہے۔ دروازہ پر ایک بھاری بھرکم علی گڑھی تالا لگا تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے نجی بریف کیس کے علاوہ چند ضخیم کتابیں، تھوڑی سبزی اور پولسن کا پاؤ بھر مکھن بھی تھا جو ہم صبح والے گوشت کو سنوارنے کی غرض سے لیتے آئے تھے۔ اب یہ ساری خرافات کہاں پھینکیں۔ ابھی ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ اچانک نگاہ اسی کمرہ کے ساتھ والے دروازے پر جا ٹکی جس کے اوپر والا روشندان کچھ اس ترتیب سے کھلا تھا کہ اس میں سے چھوٹی موٹی چیزیں بڑے مزے سے اندر پھینکی جا سکتی تھیں۔ ہماری جان میں جان آئی۔ ہم نے کتابوں کا بنڈل کھولا اور ایک ایک کر کے ساری کتابیں یکے بعد دیگرے اندر پھینکنا شروع کر دیں۔ جب سبزی کی باری آئی تو اصل مشکل پیش آئی۔ اب اس موٹی تازی لحیم شحیم لوکی کو کس طرح اندر گھسیڑیں۔ جیسے ہی اُچک کر ہم نے روشندان کے ادھ کھلے پاٹ کو مزید کھولنے کی غرض سے پکڑا، دروازہ پر ہمارا بوجھ بڑھتے ہی اس کا ایک پٹ کھل گیا اور ہم اندر گرتے گرتے بچے۔ ہم ایکدم ہکا بکا رہ گئے۔

دروازہ کے اندر قدم ڈالتے ہی کیفیت سمجھ میں آ گئی۔ دروازہ میں ایک ہی چٹخنی تھی جو غلط تختہ پر لگی تھی۔ اور یہ دروازہ تب سے اسی طرح کھلا تھا جب سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی یا یہ دروازہ

بنا تھا ـــــ یعنی لعنت ہے ایسی الغرضی اور لاپروائی پر۔ پورے دو سال سے حضرت اس کمرہ میں تشریف فرما ہیں اور ـــــ بھی حد ہو گئی۔

آئے دو علی بابا کو ہم بھی نہ بتائیں گے کہ بغیر تالا کھولے ہم اندر کیسے گھسے۔

اب اگر بغرض محال شام تک ان لوگوں میں سے کوئی بھی اِدھر نہیں آتا۔ تو ہم کریں گے کیا۔ اب جبکہ ہم نے جان ہی لیا ہے کہ کمرہ محفوظ نہیں تو اسے اس طرح بے سہارا چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے ہیں، خدانہ کرے اگر کچھ ہو جائے تو ؟

کیا ہو جائے گا۔ کمرہ میں ہے ہی کیا۔ دو معمولی قسم کے چھوٹے چھوٹے اٹیچی ہیں۔ دو تین درجن کتابیں ہیں چند پرانی سکرین پلے کی سکرپٹس اور کچھ برتن۔ ہو سکتا ہے کچھ نقدی وقدی بھی کہیں رکھی ہو کسی کونے میں۔

اب تو آپ اس کمرہ کے قیدی ہیں حضرت۔ تب تک نظر بند رہئے جب تک کہ ان لوگوں میں سے ایک آدھ آکر آپ کو نجات نہیں دلا دیتا۔

مگر وقت کیسے کٹے گا۔ کچھ پڑھا جائے، مگر پڑھنے والی عینک تو ہم اپنے ہوٹل میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ چلو سالن کو دیکھتے ہیں۔ وقت بھی کٹ جائے گا اور شام کا کھانا بھی تیار ہو جائیگا۔ یہی ٹھیک رہے گا۔ سلطان میاں دعائیں دیں گے ـــــ

باقی کہانی، یعنی اس کہانی کا اصلی پلاٹ بتانے سمجھانے کے لیے ہمیں آپ کو اس کمرہ کا پورا جغرافیہ سمجھانا ہوگا۔ دو اطراف ننگی دیواریں، ایک طرف دو دروازے، ایک بیکار جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں، اور ایک مقفل یعنی جس پر باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ اِس، یعنی ان دروازوں والی دیوار کے سامنے والی دیوار میں دروازوں کے عین سامنے دو بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جو پاٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔ البتہ لوہے کی موٹی موٹی مضبوط سلاخوں نے انہیں چوروں سے محفوظ کر رکھا ہے۔ مقفل دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے بالمقابل پانی کا نل ہے جسے دو ڈھائی فٹ کی دو طرفہ دیوار نے کمرہ سے کسی قدر علیحدہ کر رکھا ہے۔ یہ جگہ فلیٹ کے مکینوں کا باتھ روم ہے۔ اور کپڑے اور برتن دھونے مانجنے کا کونہ بھی۔

جیسے ہی ہم نے کاٹنے کی غرض سے لوکی کو ہاتھ میں پکڑا' چٹاخ' کی آواز آئی اور ساتھ والے مکان کی ہمارے عین سامنے والی کھڑکی تڑاخ سے کھل گئی۔ سامنے جو منظر تھا' وہ زندگی میں ایک ہی بار دیکھا ہے' دوبارہ دیکھنے کی ہوس بھی نہیں۔